رسالت کی خوشبو صلی اللہ علیہ وسلم

زیرِ سرپرستی :

عاشقِ رسول، شاہِ شاہاں، خواجۂ خواجگان، قطب العالم،

فقیرِ بے بدل، فقیرِ بے مثال، فقیرِ محمدی، فقیرِ فانی فی اللہ باقی باللہ

حضرت خواجہ شاہ محمد افضل

قادری چشتی (صابری نظامی) قلندری

المعروف **افضل سرکار** رحمۃ اللہ علیہ

رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو

زیر سرپرستی:

عاشقِ رسول، شاہِ شاہاں، خواجۂ خواجگان، قطب العالم،

فقیرِ بے بدل، فقیرِ بے مثال، فقیرِ محمدی، فقیرِ فانی فی اللہ باقی باللہ

حضرت خواجہ شاہ محمد افضل

قادری چشتی (صابری نظامی) قلندری

المعروف **افضل سرکار** رحمۃ اللہ علیہ

پبلشرز: حلقہ چشتیہ صابریہ عارفیہ ۶۸-۶۷، اوورسیز ہاؤسنگ سوسائٹی، بلاک ۷/۸، کراچی

نام کتاب ________ رِسالت کی خُوشبو

ترتیب و پیشکش ________ حلقہ چشتیہ صابریہ عارفیہ، کراچی

ناشر ________ حلقہ چشتیہ صابریہ عارفیہ، کراچی

تاریخِ اشاعت	تعداد
شعبان المعظم ۱۴۲۸ھ ستمبر ۲۰۰۷ء	۵۰۰۰

اختر رضا لائبریری
کتاب نمبر
صدر بازار، لاہور چھاؤنی

E-mail: arfeen@cyber.net.pk

مناجات

اے اللہ کریم ! ہم گناہ گار و خطا کار ہیں۔ ہمیشہ تیری رحمت کے امیدوار ہیں اور مشکل سے مشکل گھڑی میں تجھے ہم نے پُکارا، تُو نے ہماری پُکار اپنی رحیمی و کریمی کے صدقے میں اور وسیلۂ جلیلہ، اپنے پیارے حبیب صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا قبول فرما کر ہمیں ہمیشہ اپنی رحمت سے نوازا اور اس مشکل سے نجات دی۔ تُو کریم المعروف ہے، قدیم الاحسان ہے، حنّان و منّان و دیّان ہے، ذوالجلال والاکرام ہے اور عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور کُنْ فَیَکُوْن کی طاقت رکھتا ہے۔

تیری اس عاجز بندی نے ڈرتے ڈرتے "رِسالت کی خُوشبو" کے عنوان سے اس موضوع پر اپنے مُرشد شاہِ شاہاں، خواجۂ خواجگان، قطب العالم، فقیرِ بے بدل، فقیرِ بے مثال، فقیرِ محمّدی، فقیرِ فانی فی اللہ باقی باللہ، حضرت خواجہ شاہ مُحمّد افضل قادری، چشتی (صابری، نظامی)، قلندری المعروف "افضل سرکار" رحمتہ اللہ علیہ کے زیرِ سرپرستی یہ کتاب پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اب یہ تیری بارگاہِ عالیہ میں نذر ہے۔ اسے شرفِ قبولیت عطا فرما۔ امیدوار ہوں تو مایوس نہیں فرمائے گا۔ کاش یہ تیری اور تیرے حبیب پاک صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی خوشنودی کا باعث بنے۔ آمین ! جو جو میری خامیاں ہیں، اُن کو درگزر فرما۔

میرے پاس کوئی عذر نہیں، صرف معافی کی طلبگار ہوں۔

اس کے پڑھنے والے کی حاجتیں اور مُرادیں پوری فرما۔ اُن کو دین کی بھلائی عطا فرما۔ اُن کو اپنی اور حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اور پنجتن پاکؑ کی محبّت عطا فرما۔ یا اللہ! جو شخص بھی حاجتمند ہے وہ اس کو پڑھنے تک ہی اپنے آپ کو محدود نہ کر لے بلکہ اس میں ایسا ذوق وشوق عطا فرما کہ وہ دین کے کسی عالِم حق کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے کلامِ پاک کے معانی اور تفسیر غور سے پڑھے۔ اس کے بعد اس کو توفیق عطا فرما کہ وہ تیری اور تیرے رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اطاعت کرے تیری دی ہوئی توفیق سے۔ محض اس نیّت سے کہ تُو اور تیرے حبیبِ پاک (صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) اُس سے راضی ہو جائیں۔

دُعاگو اور دُعاجو

رابعہ ثانی

اظہارِ تشکّر

میں اپنی اُن دینی بہنوں اور بھائیوں کی ممنون ہوں، جنھوں نے دامے، درمے، سخنے اس کام میں میری مدد کی۔ اے اللہ! اُن سب پر اپنے فضل و کرم کی بارش فرما اور انہیں ہر بلائے ناگہانی، آفت، مصیبت، پریشانی، بدنامی، بے عزتی، مُفلسی، محتاجی، بیماری، قرض داری، رُجعتِ دین، ذکر و فکر اور نماز سے غفلت، سے محفوظ فرما اور انہیں اس معاونت کا اجرِ عظیم عطا فرما! آمین

دُعاگو اور دُعاجو
رابعہ ثانی

گُزارش

اس تالیف میں اگر کہیں زیر، زبر یا کتابت کی کوئی غلطی نظر آئے تو اُسے از راہِ کرم اپنے قلم سے خود درست کر لیجیے گا۔ آپ کی بڑی نوازش ہوگی۔

دُعاگو اور دُعاجو

رابعہ ثانی

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	خدیجہ رضی اللہ عنہا بنتِ خویلد	
1-	والدین	15
2-	پہلی شادی	16
3-	دوسری شادی	16
4 -	کاروبار تجارت	17
5 -	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح	19
6 -	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت	21
7 -	قبولِ اسلام	22
8 -	حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ثابت قدمی	24
9 -	وفات	25
10 -	اولاد	30
11 -	فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم	31
12 -	ولادت اور بچپن	32
13 -	شادی	33
14 -	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا غم	38
15 -	حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات	41
16 -	اخلاق وعادات	42
17 -	اولاد	44

علی ابنِ ابی طالب رضی اللہ عنہ

18 - ابتدائی حالات — 50

19 - پرورش اور قبول اسلام — 52

20 - نصرتِ اسلام — 53

21 - جاں نثاری — 56

22 - تفویضِ منصب — 58

23 - وصالِ نبوی کے بعد — 60

24 - مسندِ خلافت پر — 62

25 - حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت — 66

حضرت حسن رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ

26 - ولادت — 74

27 - بچپن اور تعلیم و تربیت — 75

28 - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و محبت — 77

29 - خلفائے راشدین کی شفقت — 80

30 - میدانِ عمل میں — 82

31 - حضرت حسن رضی اللہ عنہ ایک مشن پر — 88

32 - خلافتِ علوی میں آپ کی ذمہ داریاں — 92

33 - وصیت نامہ — 96

34 - حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت — 122

35 - بیعتِ حسن رضی اللہ عنہ — 125

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور معاویہ کی کشمکش کا پس منظر

36 - قبائل عرب کی باہمی کشمکش ______ 130
37 - قضاعہ اور بنو بکر کی جنگ ______ 133
38 - قریش کی حکومت کا آغاز ______ 135
39 - بنو عبد الدار اور بنو مناف میں اختلاف ______ 138
40 - ہاشم کی سرداری ______ 139
41 - ہاشم و اُمیہ میں عداوت کا آغاز ______ 140
42 - عبد المطلب کی سرداری ______ 142
43 - عبد المطلب اور حرب میں عداوت ______ 144
44 - ابوسفیان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت ______ 145
45 - ابوسفیان اور جنگِ اُحد ______ 156
46 - ابوسفیان کی ناپاک کوشش ______ 160
47 - ابوسفیان اور غزوۂ خندق ______ 162
48 - فتح مکہ اور ابوسفیان ______ 164
49 - ابوسفیان کی ایک اور ناکامی ______ 166
50 - ابوسفیان اسلام قبول کرتا ہے۔ ______ 169

معاویہ بن ابوسفیان

51 - ابتدائی حالات ______ 176
52 - معاویہ مسندِ امارت پر ______ 177
53 - اسلامی فتوحات میں امیر معاویہ کا حصّہ ______ 178

54 - امیر معاویہ بحیثیت بادشاہ ______ 180

55 - امیر معاویہ کی انتظامی قابلیت ______ 182

56 - فوجی انتظامات ______ 182

57 - بحری بیڑے کا قیام ______ 183

58 - ڈاک کا انتظام ______ 184

59 - زرعی ترقی کے لیے اقدامات ______ 184

60 - دفتر خاتمہ ______ 185

61 - داخلی امن کی کوششیں ______ 186

62 - امیر معاویہ کی شخصیت ______ 186

63 - خلیفۂ وقت سے بغاوت ______ 190

64 - دولت کا بے جا مصرف ______ 194

65 - سودے بازی ______ 197

66 - پروپیگنڈے کا طریقہ ______ 199

خلافت سے دست برداری

67 - خارجیوں کا رویّہ ______ 206

68 - دست برداری کا اعلان ______ 208

69 - حضرت حسن رضی اللہ عنہ زبردست قوّت کے مالک تھے ______ 209

70 - ایک اور شہادت ______ 210

71 - حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے مزاج کا تجزیہ ______ 212

72 - اصل بات ______ 217

73 - ایک اعتراض اور اس کا جواب ___ 220

74 - حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نقطۂ نگاہ ___ 223

75 - حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا نقطۂ نگاہ ___ 224

76 - صحیح نقطۂ نگاہ ___ 225

77 - دوسرا اعتراض ___ 227

78 - حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات ___ 228

سیرت و کردار

79 - حلم و بُردباری ___ 233

80 - سخاوت ___ 239

81 - عبادت و ریاضت ___ 242

82 - خدمتِ خلق ___ 243

83 - حُسنِ خُلق ___ 245

84 - لباس و غذا ___ 247

85 - رُشد و ہدایت ___ 248

86 - علم و فضل ___ 250

87 - ذہانت و نکتہ آفرینی ___ 252

88 - خطابت ___ 256

89 - نکاتِ حکمت و دانش ___ 264

باب اوّل

خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

رضی اللہ عنہا

خدیجہ بنت خویلد

رات کا بڑا حصہ گزر چکا تھا۔ مکّہ کا باعظمت اور تاریخی شہر نیند کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ ہر طرف تاریکی تھی۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سورج کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اسی تاریکی میں ایک خاتون سورج اور اس کی آب و تاب کا نظارہ کر رہی تھیں۔ یہ قریشِ مکّہ کی ایک باعزّت خاتون خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ وہ ایک خواب دیکھ رہی تھیں، خواب یہ تھا کہ آسمان سے سورج اُتر کر اُن کے مکان میں آگیا ہے اور اس کی کرنوں سے سارے مکّہ کے در و دیوار جگمگا اُٹھے ہیں۔

یہ ایسا نظارہ تھا کہ ان کی آنکھ کھل گئی اور صبح تک وہ اسی طرح کروٹیں بدلتی رہیں۔ جب کچھ روشنی نمودار ہوئی تو وہ اپنے

پچچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں اور انہیں اپنا خواب سُنایا۔ ورقہ علم تعبیر کے بہت بڑے ماہر، نہایت پاک باز اور اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے خدیجہ رضی اللہ عنہا کا خواب سُن کر کہا کہ یہ نہایت مُبارک خواب ہے۔ اور اس کی تعبیر یہ ہے کہ جلد ہی ایک ایسے شخص سے تمہاری شادی ہوگی جو منصبِ نبوّت پر سرفراز کیا جائے گا اور اس کا نوُر سارے عرب کو جگمگا دے گا۔

یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب سرزمینِ عرب پر اسلام کا آفتابِ عالم تاب طلوع نہیں ہوا تھا۔ ہر طرف جہالت کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔ اخلاقی اقدار بُری طرح پامال کی جارہی تھیں۔ دیانت و امانت، عدل و احسان اور لطف و کرم کے صفات سے اہلِ عرب کی اکثریت محروم ہوچکی تھی۔

لیکن اس گئے گزرے زمانے میں بھی خال خال ایسے لوگ نظر آجاتے تھے جن کی راست بازی، نیک نفسی اور کرم نوازی کی قسم کھائی جاسکتی تھی۔ قریش کی کریم النفس خاتون خدیجہ رضی اللہ عنہا ایسے ہی لوگوں میں سے تھیں، جو اس تاریکی کے عالم میں اپنے اخلاقِ فاضلہ کا چراغ روشن کئے ہوئے تھیں۔

والدین

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا قریش کے نامور اور بہت معزز قبیلہ بنی عبدالعزیٰ سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد کا نام خویلد تھا۔ یہ مکہ کے امیر ترین اور ممتاز فرد تھے اور دولت و امارت کے ساتھ ساتھ شرافتِ نفس، عقل و فہم اور حسن و احسان کی صفاتِ عالیہ کا پیکر تھے۔ ان کی انہی صفات کی وجہ سے اہلِ مکہ پر ان کا بڑا اثر تھا اور قریش ان کے سامنے اطاعت سے سر جھکاتے تھے۔

حضرتِ خدیجہ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت رائدہ تھا، وہ نہایت حسین و جمیل، ہنس مکھ اور عالی ظرف خاتون تھیں۔ اپنی سخاوت اور محتاجوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے اعتبار سے مکہ بھر میں مشہور تھیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اپنے والدین کی تمام صفاتِ عالیہ ورثہ میں ملی تھیں۔ وہ شیریں کلامی، مروت ہمدردی، تدبر و فراست اور وسیع النظری کے لحاظ سے عرب کی معدودے چند خواتین میں سے تھیں۔ ان کی انہی صفات کی وجہ سے والدین کو ان کے رشتہ کے معاملے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کیوں کہ اس زمانے میں ان کے پائے کے لوگ عرب

میں کم تھے۔ ان کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل ہر لحاظ سے ان کے لئے موزوں تھے۔ مگر مشکل یہ آپڑی تھی کہ ان کے والد یہ چاہتے تھے کہ جس شخص سے حضرت خدیجہ کی شادی کی جائے وہ دولت وامارت کے لحاظ سے بھی ان کی ٹکر کا ہو۔ لیکن بدقسمتی سے ورقہ کا دامن دولت مند نہ تھا۔ اس لئے وہ حضرت خدیجہ کو حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

پہلی شادی

آخر کار قرعۂ فال ابوہالہ بن نبّاش تمیمی کے نام نکلا۔ جو اخلاقِ عالیہ اور حسب ونسب کے ساتھ ساتھ سخاوت و فیاضی کے اعتبار سے بھی بڑے نامور تھے۔ چنانچہ خویلد نے ابوہالہ سے حضرت خدیجہ کا نکاح کردیا۔

دوسری شادی

پہلے شوہر کے انتقال کے کافی عرصہ بعد ان کی دوسری شادی قریش کے ایک شریف اور دولت مند شخص عتیق بن عابد

مخزومی سے ہوئی۔ مگر جلد ہی عتیق کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور حضرت خدیجہ کو دوسری بار بیوگی کا جانکاہ صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

کاروبار تجارت

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لئے یہ تیسرا جگر فراش صدمہ تھا جو ان کی کمرِ ہمت توڑ دینے کے لئے کافی تھا۔ مگر انہوں نے بڑے حوصلہ سے کام لیا اور اپنا غم غلط کرنے کے لئے کاروبارِ تجارت میں مشغول ہوگئیں۔ ان کے والد مکہ کے بہت بڑے تاجر تھے اور بہت بڑا کاروبار چھوڑ گئے تھے۔ حضرت خدیجہ نے مکہ کے بعض تاجروں کے ساتھ بات چیت کرکے انہیں نفع میں حصہ دار بنایا اور ان کے ذریعہ سے اپنا مالِ تجارت ممالک غیر کو بھیجنا شروع کردیا۔ وہ بڑی معاملہ فہم اور ذہین خاتون تھیں۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنے والد کا کاروبار اپنے ہاتھ میں لیا تو اپنی معاملہ فہمی اور ذہانت کی وجہ سے اس میں غیر معمولی ترقی کی اور جلد ہی ان کا شمار رؤسائے عرب میں ہونے لگا۔

ایک بار ان کا تجارتی مال ایک قافلے کے ساتھ شام کو جانے والا تھا کہ مکہ کے ایک بڑے سردار ابو طالب کو اس کی

خبر ہوئی۔ انہوں نے اپنے بھتیجے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو مشورہ دیا کہ میرے خیال میں اس بار تم خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کا مال لے کر شام جاؤ!

ابھی ابو طالب کے بھتیجے نے اس بارے میں حضرت خدیجہ سے بات چیت نہیں کی تھی کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو ابو طالب اور ان کے بھتیجے کے مابین ہونے والی گفتگو کا علم ہو گیا۔ وہ پہلے ہی سن چکی تھیں کہ خاندانِ عبدالمطلب میں ایک ایسا فرزند پیدا ہوا ہے جو اپنی امانت و دیانت، راست گوئی، پرہیز گاری اور شرافتِ نفس میں اپنا جواب نہیں رکھتا، چنانچہ انہوں نے فوراً ابو طالب کے پاس پیغام بھیجا کہ اپنے بھتیجے سے کہو کہ وہ میرا مال بغرضِ تجارت شام لے جائے میں اسے دوسروں سے دوگنا معاوضہ دوں گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی یہ پیش کش قبول فرمالی اور سفر پر روانہ ہو گئے۔ حضور کا یہ سفر بڑا بابرکت ثابت ہوا۔ یعنی جب آپ حضرت خدیجہ کا سامانِ تجارت فروخت کر کے واپس آئے تو معلوم ہوا کہ اس بار سال ہائے گزشتہ کے مقابلہ میں دوگنا منافع ہوا ہے۔

رسول اللہ سے نکاح

اس تجارتی سفر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ایک غلام میسرہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا۔ جسے حضرت خدیجہ نے اس لئے حضور کے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ راستے میں آپ کے آرام کا خیال رکھے۔

اس غلام نے جہاں حضرت خدیجہ کو سفر کے حالات سُنائے وہاں حضور کی پاکیزگیٔ اخلاق، عالی ہمتی اور حُسنِ معاملت کے وہ واقعات بھی بیان فرمائے جن کا اس نے سفر میں مشاہدہ کیا تھا۔ حضرت خدیجہ جو پہلے ہی حضور کی پاکیزہ سیرت کا شہرہ سُن چکی تھیں، اپنے غلام سے اس کے چشم دید واقعات سُن کر اور بھی متاثر ہوئیں۔

جب سے حضرت خدیجہ کے دوسرے شوہر کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے بعد سے برابر ان کے پاس نکاح کے پیغام آ رہے تھے۔ یہ پیغام معمولی لوگوں کے نہ تھے، پیغام دینے والوں میں قریش کے معزز اور دولت مند لوگ شامل تھے۔ لیکن حضرت خدیجہ پے در پے صدمات کی وجہ سے نکاح نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھیں، اس لئے انہوں نے یہ سارے پیغامات

ٹھکرادیئے تھے۔

مگر جب انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قالب میں ملکوتی رُوح نظر آئی تو انہوں نے حضور سے نکاح کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنی سہیلی نفیسہ بنت منیہ سے اس کا ذکر کیا۔ نفیسہ فوراً رسُول اللہ کے پاس حاضر ہوئیں اور حضرت خدیجہ کے رشتے کے متعلق عرض کیا۔ حضور رضامند ہو گئے۔ نکاح کی تاریخ مقرر کر دی گئی اور تاریخ مقررہ پر حضور اپنے چچا ابوطالب اور خاندان کے چند معززین کو لے کر حضرت خدیجہ کے مکان پر تشریف لے گئے۔

حضرت خدیجہ کے چچا عمرو بن اسد نے ان کی طرف سے ولی کے فرائض انجام دیئے۔ ابوطالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور پانچ سو طلائی درہم پر حضرت خدیجہ رسول اللہؐ کی زوجیّت سے مشرف ہو گئیں۔

نکاح کے وقت حضور کی عمر پچیس سال اور حضرت خدیجہ کی عمر چالیس تھی۔ اس واقعہ کے پندرہ سال بعد حضور منصبِ نبوّت پر فائز ہوئے۔

نکاح کے بعد رسول اللہ حضرت خدیجہ کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس طرح حضرت خدیجہ کا وہ خواب ظاہری

طور پر بھی پورا ہو گیا جس میں انہوں نے دیکھا تھا کہ جگمگاتا ہوا سورج ان کے مکان میں اتر آیا ہے۔

رسول اللہ کی خدمت

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی عسرت و تنگدستی میں گزرتی تھی ابوطالب آپ کے سرپرست تھے، لیکن کثیر العیال ہونے کی وجہ سے مالی طور پر پریشان رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں وہ اپنے بھتیجے کے لئے آرام و آسائش کے سامان کس طرح مہیا کر سکتے تھے۔ اُدھر حضور کو بھی پُر آسائش زندگی سے نفرت تھی اور کسب معاش میں اپنے شفیق چچا کا ہاتھ بٹانے کے بعد جو وقت بچتا تھا اسے یادِ الٰہی میں صرف کرتے تھے، مگر معاش کی طرف سے جو اطمینان ہونا چاہیئے تھا وہ نہ تھا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے بعد یہ پریشانی بھی دور ہو گئی اور آپ نے اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ اس کارخانۂ قدرت اور اس کے صانع حقیقی کی ہستی پر غور و خوض شروع کر دیا۔

حضرت خدیجہ اپنے شوہر کی خلوت پسندی سے ذرا نہ

گھبرائیں اور نہ کسی قسم کی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ جب حضور عبادت و ریاضت کی غرض سے شہر سے باہر تشریف لے جاتے، تو حضرت خدیجہ ان کے لئے کھانے پینے کا انتظام کرتیں اور ضروریات کی ساری چیزیں مہیّا کر کے ان کے ساتھ کر دیتیں۔ جب حضور واپس آتے تو بڑی خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتیں اور گھر میں انہیں ہر طرح سے آرام پہنچاتیں۔

بعض دفعہ کئی کئی روز گزر جاتے اور حضور واپس تشریف نہ لاتے تو حضرت خدیجہ ان کو تلاش کرنے کے لئے خود ہی نکلتیں، کبھی کبھی کھانا تیار کر کے وہ خود غارِ حرا میں لے جاتیں، جہاں حضور عبادت کیا کرتے تھے۔ باوجودیکہ اس غار تک پہنچنے کا راستہ بڑا دشوار گزار تھا اور عام مرد بھی وہاں تک پہنچنے میں دِقّت محسوس کرتے تھے۔ مگر حضرت خدیجہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو والہانہ محبت تھی، اس میں راستے کی یہ دشواریاں قطعاً حائل نہ ہو سکیں۔

قبولِ اسلام

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کئے ہوئے حضور کو پندرہ سال ہوئے تھے کہ جبلِ حرا کے غار میں آپ کو نبوّت

کی بشارت دی گئی۔ جب آپ نے حضرت خدیجہ کے سامنے اس کا اظہار کیا تو انہوں نے بے چون وچرا حضور کے دعوے کی تصدیق کردی۔

اس کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ جو نہایت متقی اور انجیل کے بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے ساری روداد سُن کر بشارت دی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو فرشتہ آیا تھا یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی لایا تھا۔ ورقہ نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہوں گے۔ اور ان کی قوم انہیں اس شہر سے نکال دے گی۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو ان کی مدد کروں گا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تو پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کر چکی تھیں۔ ورقہ کے اس بیان کے بعد ان کا یقین اور پختہ ہوگیا۔ اور انہوں نے کارِ نبوّت میں نہایت استقلال سے حضور کی مدد شروع کردی۔ وہ رسول اللہ کے ساتھ مل کر نماز پڑھتیں اور عرصہ تک دنیا میں صرف یہی دو مومن اللہ تعالیٰ کے حضور رکوع وسجود کرتے رہے، مگر یہ نفل نماز تھی، کیوں کہ ابھی نماز فرض نہیں ہوئی تھی۔

پھر ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اللہ تعالیٰ کا فرشتہ آیا اور اس نے آپ کو وضو کرنے اور نماز پڑھنے کا معروف طریقہ بتایا۔ آپ نے یہ طریقہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سکھایا اور پھر دونوں نماز ادا کرنے لگے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ثابت قدمی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ ہی آپ پر اور آپ کی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹنے لگے۔ ہر طرف سے مخالفتوں کے طوفان کھڑے ہو گئے۔ غیر تو غیر تھے۔ رسول اللہ اور حضرت خدیجہ کے اعزا و اقربا بھی درپئے آزار ہو گئے۔ مگر حضرت خدیجہ نے ہر موقع پر ثبات و استقلال کا حیرت انگیز نمونہ دکھایا۔ وہ ہر موقع پر رسول اللہ کی معاون و مددگار اور ہمدرد و غمخوار ثابت ہوئیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا مکہ کی بڑی ذی اثر خاتون تھیں۔ اور ان کا قبیلہ مکہ کے چند بڑے اور طاقت ور قبیلوں میں سے تھا۔ اس لئے کفار رسول اللہ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتے تھے۔ پس اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے صرف زبانی ہی رسول اللہ کی تصدیق اور اعانت نہیں کی بلکہ

اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش مکہ کی اذیت سے محفوظ رکھا۔ پھر انہوں نے اپنے مال سے بھی حضور کے مشن کی نشر و اشاعت میں بڑی امداد کی اور روپے کو پانی کی طرح بہایا۔ بعثت نبوی کے ساتویں سال جب قریش مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے متبعین اور بنو ہاشم کا اقتصادی اور معاشرتی مقاطع کر دیا اور آپ شعب ابو طالب میں محصور ہونے پر مجبور کر دیئے گئے تو اس موقع پر بھی حضرت خدیجہ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ وہ نہ صرف یہ کہ حضور کے ساتھ گھاٹی میں محصور ہو گئیں۔ بلکہ اپنے بچے کھچے سرمایہ سے جس قدر کھانے پینے کی چیزیں خریدی جا سکتی تھیں وہ خرید کر ساتھ لے گئیں اور عرصہ دراز تک حضور اور آپ کے ساتھ محصورین کے لئے قوتِ لایموت مہیا کرتی رہیں۔ لیکن جب سامانِ خوراک ختم ہو گیا اور محصورین نے فاقے کرنا شروع کئے تو حضرت خدیجہ بھی اس فاقہ کشی میں برابر کی شریک رہیں۔

وفات

جب محاصرہ کی میعاد نے طول کھینچا اور فاقوں سے مارے

ہوئے بچّوں کی صداؤں سے مکّہ کی پہاڑیاں گونجنے لگیں، تو مکّہ کے چند شریف اور رحم دل لوگوں کو ترس آیا، ان رحم دل اور ترس کھانے والوں لوگوں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حکیم بن حزام پیش پیش تھے۔ یہ اور حضرت خدیجہ کے خاندان کے بعض اور لوگ بھی قریش سے چھُپاکر غلّہ اور خورد ونوش کی دوسری اشیاء محصورین کو بھیجتے رہتے تھے۔ آخر ان ہی لوگوں کی کوششوں سے یہ مقاطع ختم ہو گیا اور مسلمان پھر اپنے گھروں میں آباد ہو گئے۔

مگر اس دوران میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو جو مصائب پیش آئے، وہ بڑے اذیت ناک تھے۔ بھوک، پیاس کی تکلیفوں نے ان کے جسم کو کمزور کر دیا تھا۔ ان کی عمر بھی پینسٹھ (۶۵) سال کے قریب ہو چکی تھی۔ اس ضعیفی کے زمانے میں یہ مصائب اور بھی ناقابلِ برداشت تھے۔

چنانچہ مصائب و آلام نے انہیں بے حد لاغر اور بیمار کر دیا تھا۔ اور محاصرہ ختم ہونے کے بعد کچھ عرصہ زندہ رہ کر انتقال کر گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؁ ان کی وفات ہجرت سے تین سال قبل گیارہ رمضان کو ہوئی۔ نعش کو قبر میں اُتارنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود قبر میں اُترے۔

حضرت خدیجہ کی وفات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بہت بڑا صدمہ تھا جسے آپ ساری عمر محسوس کرتے رہے۔ جب تک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں آپ نے دوسری شادی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بطن سے حضور کو اولاد عطا فرمائی، باوجودیکہ حضرت خدیجہ کے انتقال کے بعد حضور نے متعدد عورتوں سے شادیاں کیں، جن میں بیوہ بھی تھیں اور کنواری بھی۔ ان میں عرب کی حسین وجمیل عورتیں بھی تھیں اور عقیل وفہیم بھی، وہ حضور سے بے حد محبت کرتیں اور آپ کو آرام پہنچانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑتیں۔

مگر سچ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی حضرت خدیجہ کی جگہ نہ لے سکی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آخر تک حضور کی شخصیت پر چھائی رہیں۔ اکثر آپ انہیں یاد کر کے آب دیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ وہ دنیا میں سب سے پہلی ہستی تھیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لائیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی شادی ہوئی تو وہ مکہ کی امیر ترین خاتون تھیں مگر جب ان کا انتقال ہوا تو مکہ میں شاید ہی کوئی ان سے زیادہ غریب ہو۔ یہ ساری دولت انہوں نے رسول اللہ او اسلام پر نثار کر دی۔

اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جس قدر احسانات حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ہیں اتنے سوائے ابو طالب کے اور کسی کے نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اپنے دل سے ان کا خیال آخر تک جُدا نہ کر سکے، خود اللہ تعالیٰ کی نظر میں بھی حضرت خدیجہ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔

چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک روز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حضور کے لئے برتن میں کوئی چیز لے کر آ رہی تھیں۔ کہ جبرائیل آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ

"خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کے لئے
برتن میں کچھ لا رہی ہیں، آپ انہیں
خدا تعالیٰ کا اور میرا سلام کہہ دیجئے"۔

اسی طرح ایک روز حضرت جبرائیل نے حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "خدیجہ رضی اللہ عنہا کو بشارت دیجئے کہ انہیں جنت میں ایسا گھر ملے گا جو موتی کا بنا ہو گا اور وہاں نہ محنت کرنی پڑے گی اور نہ شور و غل کو دخل ہو گا"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا

سے اس قدر محبت تھی اور وہ اس کثرت سے ان کا ذکر فرماتے رہتے تھے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ مجھے ان پر رشک آنے لگا۔

ایک روایت یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سوائے مجھے اور کسی پر رشک نہیں آیا۔

ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ذکر فرما رہے تھے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا درمیان میں بول اٹھیں "آپ ہر وقت حضرت خدیجہ کو یاد کرتے رہتے ہیں حالانکہ وہ بوڑھی تھیں، خدا تعالیٰ نے آپ کو ان سے اچھی بیویاں عطا فرمائی ہیں"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کے یہ الفاظ برداشت نہ کر سکے اور بڑے رنج کے لہجے میں فرمایا کہ "عائشہ! (رضی اللہ عنہا) ایسا نہ کہو، جب میری ساری قوم مجھے جھٹلا رہی تھی، اس وقت صرف خدیجہ (رضی اللہ عنہا) تھیں جس نے میری تصدیق کی، جس وقت لوگ میری بات سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے اور کوئی ایک درہم دینے والا نہ تھا، اس وقت اس نے اپنا سارا مال میرے قدموں میں لا ڈالا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بطن سے مجھے اولاد

کی نعمت سے نوازا۔

اولاد

اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہ کے بطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھ اولادیں عطا فرمائیں۔

۱۔ حضرت قاسم رضی اللہ عنہ۔
۲۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا۔
۳۔ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ۔
۴۔ حضرت رقیہؓ رضی اللہ عنہا۔
۵۔ حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا۔
۶۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا۔

ان میں سے حضرت قاسم اور حضرت عبد اللہ کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صاحبزادیاں پیدا ہوئیں، ان میں سے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو تاریخِ اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہیں ہماری کتاب کی مرکزی شخصیت (حضرت امام حسنؑ) کی مادرِ گرامی بننے کا شرف حاصل ہوا۔

فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بیت اللہ میں قریش مکّہ کے بے فکرے جمع تھے ہر طرف سے قہقہے بلند ہو رہے تھے، آوازے کسے جا رہے تھے، ان قہقہوں کا نشانہ عرب کا وہ اُمّی پیغمبر تھا جو لوگوں سے کہتا تھا کہ بے جان بُتوں کی پرستش چھوڑ کر قادرِ مطلق خدا کی عبادت کرو، اس وقت وہ خانہ کعبہ کے ایک کونے میں ساری دُنیا سے مُنہ موڑے اور ہر قسم کے تمسخّر سے بے نیاز اپنے مولا کے حضور قیام و سجود میں مصروف تھا۔

ابھی سجدے ہی میں تھے کہ ایک بد بخت (عقبہ بن ابی معیط) نے آگے بڑھ کر اُونٹ کی اوجھڑی اُن کی پیٹھ پر ڈال دی ہر طرف سے قہقہوں کا ایک سیلاب اُمنڈ پڑا۔ اور لوگ فرطِ مسرت سے بے قابو ہو کر ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ اتنے میں چھ سات سال کی ایک بچّی دوڑتی ہوئی آئی اور رسولِ عربی کی پُشت مُبارک سے اوجھ ہٹا کر ایک طرف پھینکا اور عقبہ کو بڑی سختی سے ڈانٹنے لگی۔

ولادت اور بچپن

اس بچّی کا نام فاطمہ (رضی اللہ عنہا) تھا۔ فاطمہ، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی بیٹی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد محبوب تھیں۔ وہ سہ ۱ نبوی میں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی سے نہایت سنجیدہ، بڑی شائستہ اور صاحبِ جرأت تھیں۔

سطور بالا میں ان کے بچپن کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ ان کی فطری دلیری اور غیر معمولی شجاعت پر دلالت کرتا ہے۔ چھ سات سال کی عمر میں تن تنہا مکّہ کے سرکش لوگوں کے مجمع میں آکر اپنے والد گرامی کو اونٹ کے اوجھ سے آزاد کرنا اور اکابر قریش کو سخت سُست کہنا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تاریخ اسلام کے ان چند خوش قسمت نفوس میں سے تھیں کہ دنیا کی دو عظیم ترین ہستیوں نے جن کی پرورش اور تعلیم و تربیت فرمائی۔ انہوں نے رسول اللہ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے زیرِ نگرانی تربیت اخلاق کے تمام مراحل طے کئے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ہوش سنبھالا تو حضرت خدیجہ

بوڑھی ہو چکی تھیں۔ یہ حضرت فاطمہ ہی تھیں جنھوں نے سن رسیدہ والدہ کا گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹایا۔ بلکہ قریب قریب انہیں اس بار سے سبکدوش کردیا۔ وہ امورِ خانہ داری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس قدر مشقت برداشت کرتی تھیں کہ حضور نے انہیں اتنی زیادہ محنت کرنے سے منع کر دیا کہ کہیں صحت خراب نہ ہو جائے۔

شادی

جب حضرت فاطمہ کی عمر تقریباً ساڑھے پندرہ سال ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچازاد بھائی حضرت علی ابنِ ابی طالب سے ذی الحجہ ۲ھ میں چار سو درہم مہر پر ان کی شادی کردی۔ شادی کی تقریب میں آپ نے اپنے صحابہ کو مدعو کیا اور ان کے سامنے مندرجہ ذیل خطبۂ نکاح پڑھا۔

"اللہ کا شکر ہے جو اپنی نعمتوں کی وجہ سے تعریف کے قابل ہے اور اپنی قدرتوں کی وجہ سے عبادت کے لائق ہے، اس کا اقتدار ہر جگہ قائم ہے، اس کا حکم زمین و آسمان میں نافذ ہے۔ اس نے مخلوق کو

اپنی قدرت سے بنایا، اپنے احکام کے ذریعہ سے
انہیں آپس میں علیحدہ علیحدہ کیا، انہیں اپنے دین
کے ذریعہ عزت بخشی اور اپنے نبی کے ذریعہ سے
سربلند کیا، بے شک اللہ تعالیٰ نے شادی بیاہ کو
ایک لازم امر قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وھو الذی خلق من السماءِ بشرًا
فجعلہ نسبًا وصھرًا وکان
ربك قدیرًا

"وہی ذات پاک ہے جس نے انسان کو پیدا کیا
اور بعض کو بعض کی بیٹی بیٹا اور داماد بنایا اور تیرا رب
ہر چیز پر قادر ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے قضا و قدر کو کام کرنے کا حکم دیا ہے قضا و
قدر کا ایک وقت مقرر ہے اور ہر چیز اپنے وقت پر ہی پوری
ہوتی ہے۔

میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے فاطمہ (رضی اللہ عنہا)
کا نکاح علی (رضی اللہ عنہ) سے چار سو مثقال مہر کے عوض کر
دیا ہے۔

خطبہ نکاح کے بعد کھجوروں سے حاضرین کی تواضع کی گئی۔

اور تھوڑی دیر کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ اپنے والد گرامی سے رخصت ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر چلی گئیں۔ اُمّ ایمن اُن کے ساتھ گئیں تاکہ نئے گھر میں ان کا دل نہ گھبرائے۔ عشاء کی نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ سے ملنے ان کے گھر تشریف لے گئے اور اندر داخل ہونے سے پہلے اذن طلب کیا۔ گھر میں جا کر آپ نے حضرت فاطمہ اور حضرت علی دونوں کے لئے دُعا کی۔

جب حضور واپس آنے لگے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جوشِ محبت اور آپ سے جُدائی کا خیال کر کے رو پڑیں۔ اس وقت حضور نے انہیں تسلی دی۔ اور فرمایا کہ میں نے اپنے خاندان کے افضل ترین شخص سے تمہارا نکاح کیا ہے۔

آں حضرت نے اپنی اس چہیتی بیٹی کو جہیز کے طور پر جو اشیاء عطا فرمائیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

چمڑے کا ایک گدّا جس میں کھجور کے پتّے بھرے ہوئے تھے، مٹّی کے دو گھڑے، ایک چھاگل، دو چکیاں، ایک مُشک اور ایک چارپائی اور وہ تین کپڑے جو آپ کے جسم پر تھے، اس کے علاوہ زیور یا برتن اور کپڑے کی قسم کی کوئی چیز نہیں دی گئی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو

جو کچھ نذر کیا وہ ایک پُرانی چادر اور بھیڑ کی ایک کھال تھی۔
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس بزرگ تر ہستی کی صاحبزادی تھیں جس کی زندگی فقر و فاقہ میں گزری اور جس نے اپنے گھر کے کام کاج کے لئے کبھی لونڈی غلام نہیں رکھے۔ اس لئے وہ ابتداء ہی سے محنت و مشقت کی عادی تھیں۔

ان کی شادی بھی ایک ایسی ہستی سے ہوئی جن کا دامن ہر قسم کی دولت سے بھرا ہوا تھا مگر سونے چاندی سے خالی تھا۔ اس لئے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ساری عمر افلاس و تنگدستی میں گزاری مگر کبھی حرفِ شکوہ زبان پر نہ لائیں۔

انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت کرنے میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان پر جان چھڑکتے تھے اور اُن کی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔

جب تک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ زندہ رہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے دوسری شادی کا خیال تک نہ کیا۔ غرض دونوں کی خانگی زندگی بڑی خوشگوار اور پُرسکون ماحول میں بسر ہو رہی تھی کہ اچانک اس پُرسکون ماحول میں طوفان عظیم برپا ہو گیا۔ ہماری مُراد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے ہے۔ جب حضور

مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بیشتر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بسر ہونے لگا۔

وفات سے ایک روز پہلے کا واقعہ ہے کہ حضرت فاطمہ اپنے گھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیمار داری کرنے کے لئے روانہ ہونے والی تھیں کہ حضور کی طرف سے بُلاوا آگیا۔ آپ فوراً خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں۔ حضور نے دیکھ کر تبسم کیا اور فرمایا۔" آؤ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) پھر انہیں اپنے دائیں طرف بٹھالیا اور کان میں چُپکے چُپکے کچھ باتیں کیں جنہیں سُن کر حضرت فاطمہ رونے لگیں۔ پھر کچھ باتیں کیں، جنہیں سُن کر وہ ہنسنے لگیں۔

وصال کے بعد جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پہلے رونے اور پھر ہنسنے کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے بیان کیا:۔

"پہلے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں اسی مرض میں فوت ہو جاؤں گا یہ سُن کر میں رونے لگی، پھر آپ نے فرمایا کہ میرے اہلِ بیت میں سے سب سے پہلے تم مجھ سے ملوگی۔ یہ سُن کر میں ہنسنے لگی۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ کے پاس موجود تھیں۔ اور جب حضور

پر نزع کا عالم طاری ہوا تو آپ کی تکلیف دیکھ کر وہ بے قرار ہو گئیں اور کہنے لگیں "واکرب اباہ ، واکرب اباہ "۔ حضور نے فرمایا کہ بیٹی آج کے بعد تیرا باپ بے چین نہیں ہو گا"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا غم

اس کے بعد ہی آپ کی رُوح قفس عنصری سے پرواز کر کے ملاء اعلیٰ میں پہنچ گئی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا جو صدمہ ہوا وہ بیان سے باہر ہے اور کسی میں اتنی قدرت نہیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غم واندوہ کی کیفیت معلوم کر کے اسے تحریر کر سکے۔

البتہ اس موقع پر انہوں نے جو مرثیے پڑھے ان سے ان کے غم والم کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ تجہیز و تکفین کے دوسرے روز، اور ایک روایت کے مطابق اسی روز آپ حضور کے مزار پُر انوار پر حاضر ہوئیں اور قبر سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر چہرے پر ملی پھر یہ مرثیہ پڑھا:۔

ماذا علی من شم تربت	تربتِ رسول اللہ کی مٹی سونگھنے والے
احمد الایشم مدلی	پر لازم ہے کہ وہ ہر خوشبو سے

الزمان عوالیا۔	بے نیاز ہو جائے۔
صبت علی مصائب	مجھ پر مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹے
لو انھا صبت علی	ہیں وہ ایسے ہیں کہ اگر دنوں پر ٹوٹتے
الایام عدن لیالیا۔	تو وہ راتوں سے بدل جاتے۔

اسی طرح ایک روز آپ، رسُول اللہ علیہ وسلم کے مزارِ مبارک کے سرہانے کھڑی تھیں اور وفورِ جذبات سے آنکھیں اشکبار تھیں کہ بے ساختہ مندرجہ ذیل اشعار آپ کی زبان پر جاری ہو گئے:۔

اغبر آفاق السماء وکدرت	آسمان کی وسعتوں پر غبار چھا
شمس النھار واظلم	گیا، آفتاب کو لپیٹ دیا گیا
العصراف والارض من	دُنیا سیاہ پوش ہو گئی، فرقتِ
بعد النبی کیبتہ اسف	رسُول اللہ میں، زمین پر غم والم
علیہ الکثیرہ الاحزان	اور افسردگی چھاگئی، اہلِ مشرق و
فلیبلہ شرق البلاد	اہلِ مغرب دونوں کو حضور کے
وغربھا ولتکبہ	سانحہ وفات پر اشک باری
مضرو کل یمان	کرنا چاہیئے۔ اور اہلِ مصر اور
یاخاتم المرسل	اہلِ یمین کو آہ و بکا کرنا چاہیئے۔

المبارك صلوة صلى	اے خاتم النبیین جن پر قرآن
علیك منزل القرآن	نازل ہوا تھا، آپ کو خدا تعالیٰ
	اپنی رحمتوں کی چادر میں ڈھانپ
	لے۔

پھر ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں بے قرار ہو کر مندرجہ ذیل اشعار کہے:

انا فقد ناك فقد الارض	ہم حضور سے محروم ہو کر یوں
وابلها وغاب مذ غبت	ہو گئے جیسے زمین سے نمی و
عنا الوحی والکتب	تازگی کو جدا کر دیا جائے جب
نلیت قبلك كان الموت	سے حضور دنیا سے گئے ہیں، وحی
صادها لما الغیت	الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ جس
ومالت دونكسا الكتب	وقت حضور کا وصال ہوا اور مٹی
	نے آپ کو اپنے اندر چھپا لیا،
	کاش اس وقت سے پہلے
	ہمیں موت آگئی ہوتی۔

حضرت امام بخاری فرماتے ہیں کہ جب لوگ حضور کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر واپس آئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا

نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر مشہور صحابی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے کہا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خاک ڈالنا کیسے گوارا کر لیا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے شب و روز تاریک ہو گئے اور پھر کسی نے ان کے چہرے پر تبسم نہ دیکھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا معمول ہو گیا تھا کہ ہر روز دن میں ایک دو بار حضور کے مزار پُر انوار پر جاتیں اور سرہانے کھڑے ہو کر آنسو بہاتیں۔ آخر یہی غم ان کی جان لینے کا باعث ہوا۔

وہ حضور کے وصال کے چھ ماہ بعد تین رمضان سنہ ۱۱ھ کو انتقال فرما گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؁ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زوجہ حضرت اسماء سلمی، خادمہ رسول اور صفیہ بنت عبدالمطلب نے مل کر آپ کو غسل دیا۔ حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہم جنازہ باہر لائے۔ حضرت علی نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

•

اخلاق و عادات

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بے نظیر اخلاق کی مالک تھیں۔ ان کی عادات بڑی پاکیزہ اور ان کا کردار مثالی تھا۔ وہ دین و دُنیا کے بادشاہ کی سب سے زیادہ پیاری صاحبزادی تھیں مگر اس کے باوجود ان میں کسی قسم کے فخر کا شائبہ تک نہ تھا۔ انہوں نے کبھی اپنے آپ کو اُمّت کی دیگر عورتوں سے ممتاز نہ سمجھا حالانکہ وہ سب سے ممتاز تھیں۔ وہ نہایت درجہ کی راست باز اور صاف گو تھیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ" فاطمہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ صاف گو اور کوئی میری نظر سے نہیں گزرا سوائے رسول اللہ کے

ان کے مزاج میں حیا کا بے حد مادہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک روز اسماء بنت عمیس سے فرمایا کہ لوگ عورتوں کا جنازہ کھلا ہوا لے جاتے ہیں، مجھے اس سے بڑی حیا آتی ہے۔ حضرت اسماء نے کہا کہ جب میں حبش میں تھی تو میں نے وہاں کی عورتوں کا جنازہ تیار کرنے کا ایک عجیب طریقہ دیکھا تھا، یہ کہہ کر انہوں نے کھجوروں کی کچھ شاخیں منگوائیں اور کمان کی

سی شکل بنا کر ان پر پردہ ڈال دیا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو یہ طریقہ بہت پسند آیا۔ اور انہوں نے وصیت کردی کہ میرا جنازہ اسی طرح اٹھایا جائے چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تاریخِ اسلام کی پہلی خاتون ہیں جن کا جنازہ مذکورہ بالا طریقہ سے اٹھایا گیا۔

شجاعت بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی سیرت کا نمایاں جوہر تھا۔ وہ تاریخِ اسلام کی ان معدودے چند خواتین میں سے ہیں جنہوں نے میدان جنگ میں جاکر عملی حصّہ لیا۔

چنانچہ جنگِ اُحد کا واقعہ ہے کہ کسی نے مشہور کر دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم شہید ہو گئے ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بیقرار ہو کر گھر سے نکلیں اور حضور کو ڈھونڈنے کے لئے میدانِ جنگ میں پہنچ گئیں۔ معاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر پڑی، دیکھا کہ جسمِ مُبارک سے خوُن بہہ رہا ہے۔ چنانچہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حضور کی تیمار داری کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ڈھال میں پانی بھر بھر کر لاتے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا زخموں کو دھوتیں جب زخم صاف ہو گئے تو حضرت فاطمہ نے کھجور کی چٹائی جلا کر اس کی راکھ زخموں میں بھری جس سے خون فوراً بند ہو گیا۔

اس کے علاوہ بعض اور جنگوں میں بھی ان کی شمولیت کا ذکر آیا ہے، ان جنگوں میں شامل ہو کر انہوں نے پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی خدمات انجام دیں۔ ان کی بے خوفی اور دلیری کا ایک واقعہ اس باب کے آغاز میں بھی درج کیا جا چکا ہے کہ انہوں نے خانہ کعبہ میں داخل ہو کر کس طرح تن تنہا حضور کی پشت مبارک کو اونٹ کے اوجھ سے آزاد کیا۔ اور اوجھ رکھنے والے کو بڑی سختی سے ڈانٹا۔ گویا شجاعت و بسالت اور بے خوفی جو بنی ہاشم کا طرّہ امتیاز تھی اس سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ نے حصّہ وافر پایا تھا۔

اولاد

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت امام حسن حضرت امام حسین، حضرت اُمّ کلثوم اور حضرت زینب (رضی اللہ عنہم اجمعین) پیدا ہوئیں۔

بعض مؤرخین نے آپ کی اولادوں کے ناموں میں حضرت محسن رضی اللہ عنہ اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ یہ دونوں بچّے صغر سنی ہی میں فوت ہو گئے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں حضرت امام حسن حضرت امام حسین اور حضرت زینب نے غیر معمولی شہرت پائی اور اپنی منفرد حیثیوں کی وجہ سے تاریخِ عالم میں زندہ جاوید ہو گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ

ابنِ ابی طالب

علی ابنِ ابی طالب رضی اللہ عنہ

مکہ کی سادہ مگر تاریخی عمارت "دارالندوہ" کے در و دیوار گرماگرم گفتگو سے گونج رہے تھے۔ آج اس عمارت میں تاریخِ عالم کا سب سے زیادہ ناپاک اجتماع منعقد کیا گیا تھا۔ اس اجتماع کا مقصد یہ تھا کہ عبدالمطلب کے پوتے اور ابوطالب کے اس نامور بھتیجے سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے جس کی تعلیم کا سیلاب سارے مکہ کو اپنی رو میں بہائے لئے جا رہا ہے۔ اور جس کی موجیں اب مکہ سے نکل کر مضافات کو بھی اپنی آغوش میں لے رہی ہیں۔

اس اجتماع میں قبائل قریش کے تمام بڑے بڑے سردار ابوجہل، ابوسفیان، حارث بن عامر، نصر بن حارث، عتبہ، حکیم بن حزام، ابوالبختری اور اُمیہ بن خلف وغیرہم شریک تھے۔ ہر سردار اپنے فہم ادراک کے مطابق تجاویز پیش کر رہا تھا۔ ایک شخص نے رائے دی کہ اس شخص (آں حضورؐ) کو پکڑ کر اس

کے گلے میں طوق اور پیروں میں زنجیریں ڈال دو اور کسی مکان میں بند کردو۔ اس طرح ہم سب اس مصیبت سے نجات پا جائیں گے۔

ایک دوسرے شخص نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا "محمدؐ" کی گرفتاری کی خبر پوشیدہ نہیں رہے گی اور مسلمان اسے رہا کرالیں گے۔

ایک اور شخص نے تجویز پیش کی کہ میرے خیال میں اس شخص سے چھٹکارا پانے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسے پکڑ کر کسی سرکش اُونٹ پر بٹھا دیا جائے اور اس اُونٹ کو مکّہ سے نکال دیا جائے، اس طرح مکّہ اس سے نجات پا جائے گا۔

ایک جہاں دیدہ سردار نے اس تجویز کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان میں کس قدر جادو اور اس کی گفتگو میں کتنی حلاوت ہے۔ یہ جہاں جائے گا وہاں کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لے گا۔ اور اپنے ان نئے پیروؤں کو ساتھ لے کر تم پر حملہ کردے گا۔

جب یہ دونوں تجویزیں رد کر دی گئیں تو ان میں سے سب سے بڑے سردار نے جو سب سے زیادہ بدطینت بھی تھا۔ ایک نہایت خطرناک تجویز پیش کی۔ اس سردار نے جس کا نام ابوجہل

تھا۔ اس نے اپنی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) زندہ ہے اس وقت تک ہم اس مصیبت سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ لیکن ہم میں سے جس قبیلے کا فرد اُسے قتل کرے گا، بنو ہاشم اسے تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑیں گے۔ اس لئے میرے خیال میں مکّہ کے ہر قبیلے میں سے ایک ایک بہادر شخص کو منتخب کر لیا جائے۔ یہ سب مل کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مکان کا محاصرہ کر لیں اور جب وہ نمازِ فجر ادا کرنے کے لئے گھر سے نکلے تو یہ سب یکبارگی اس پر ٹوٹ پڑیں۔ اس طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتل کا الزام کسی ایک قبیلے پر نہیں آئے گا۔ بلکہ سارے قبیلے اس میں شریک سمجھے جائیں گے اور ظاہر ہے کہ بنو ہاشم سارے قبائل سے جنگ نہیں کر سکیں گے۔ اور نہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیروؤں کو ان سے انتقام لینے کی ہمت ہوگی۔

ابو جہل کی اس تجویز پر ہر طرف سے تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسنے لگے۔ اور اس کی تجویز اتفاق رائے سے منظور کر لی گئی۔ پھر ایک مقررہ تاریخ کو قبائل قریش کے چیدہ چیدہ بہادروں نے کاشانۂ نبوت کا محاصرہ کر لیا۔

جب رات کافی بھیگ گئی تو آنحضرت اپنی چارپائی سے

اُٹھے اور اپنے گھر کے ایک نوجوان کو ہدایت فرمائی کہ تم میری چادر اوڑھ کر میرے بستر پر لیٹ جاؤ۔

نوجوان بلا کسی پس و پیش کے اور یہ سوچے بغیر بستر پر لیٹ گیا کہ اس بستر پر لیٹنے والا خون میں نہائے بغیر نہ رہے گا۔ یہ وہ نوجوان تھا جسے تاریخ علی ابنِ ابی طالب (رضی اللہ عنہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

ابتدائی حالات

حضرت علی رضی اللہ عنہ بعثت نبوی سے دس سال قبل بنو ہاشم کے ایک نامور سردار ابوطالب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابو طالب کہ جن کا نام عبد مناف تھا۔ آنحضرت کے حقیقی چچا تھے اور حضور سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ حضور کی پرورش بھی انہی ابوطالب نے کی تھی۔ اور آپ کی حمایت میں ہر وقت کمربستہ رہتے تھے۔

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جب تک ابوطالب زندہ رہے آنحضرت کے لئے ڈھال بنے رہے۔ اور ان کی زندگی میں قریش کے بڑے سے بڑے بہادر کو بھی آپ کے خلاف کوئی ناپاک اقدام کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا

کہ قریش کے اکابر وفود لے لے کر اُن کے پاس آتے اور ان سے درخواست کرتے کہ اپنے بھتیجے کو اس نئے دین کی تبلیغ سے روکئے۔ مگر ابوطالب انہیں ہر بار جواب صاف دے کر رخصت کر دیتے۔

ایک بار انہوں نے بڑی جرأت سے کام لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا کہ میرے بھتیجے! تم پوری آزادی سے اپنے دین کی تبلیغ کرو۔ کسی کی مجال نہیں کہ تمہارا بال بھی بیکا کر سکے۔ ابوطالب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کی حمایت کی بڑی گراں قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ جب انہیں بنو ہاشم کو ساتھ لے کر پہاڑی کی ایک گھاٹی میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ مگر ان کے پائے ثبات واستقلال میں جنبش تک نہ آئی اور نہ انہوں نے کبھی حضور سے اس قسم کا شکوہ کیا کہ تمہاری وجہ سے ہم پانی کے ایک ایک قطرے اور اناج کے ایک ایک دانے کو ترس رہے ہیں۔ بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے ان سارے مصائب و آلام کو برداشت کیا۔

ابوطالب کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت فاطمہ بنت اسد (رضی اللہ عنہا) بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت کرتی تھیں اور انہوں نے بھی حضور کی پرورش

اپنے جگر گوشوں کی طرح بلکہ ان سے بھی بڑھ کر کی۔ انہیں بھی اپنے نامور شوہر کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور ہونا پڑا اور انہوں نے بھی اس راستے کی ہر کلفت کو نہایت استقلال سے برداشت کیا۔

پرورش اور قبولِ اسلام

حضرت علی کی عمر پانچ سال کی تھی کہ مکہ میں ایک سخت قحط پڑا، چونکہ ابو طالب نہایت کثیر اولاد بزرگ تھے، پہلے ہی عسرت کی حالت میں زندگی گزار رہے تھے۔ اس قحط کی مصیبت نے آپ کی تنگ دستی نے اور بھی اضافہ کر دیا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر آنحضرت اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو لے کر ابو طالب کے پاس گئے اور ان سے کہا۔ کہ چچا جان! ہم چاہتے ہیں کہ آپ کا کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے اگر آپ پسند کریں تو ہم دونوں آپ کے بیٹوں کی کفالت اپنے ذمہ لے لیں۔ اس گفتگو کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جعفر بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) کو اور آنحضرت نے علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) کو پرورش کے لئے منتخب کر لیا۔

چنانچہ پانچ سال کی عمر سے لے کر ساڑھے پچیس سال کی عمر تک حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ سایہ پرورش پاتے رہے۔ اس طرح کاشانۂ نبوت میں رہ کر تعلیم و تربیت کے جو مواقع حضرت علی رضی اللہ عنہ کو میسر آئے، وہ دوسرے صحابہ کو نہیں مل سکے اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دنیا کے اُن معدودے چند مقدس نفوس میں سے تھے جن کی تعلیم و تربیت رسولِ گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بنفسِ نفیس فرمائی۔ آپ کی عمر دس سال کی تھی کہ آں حضرت کو منصبِ نبوّت پر سرفراز فرمایا گیا۔ اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور کے اس منصب جلیلہ کی خبر ہوئی تو آپ نے اپنی سلامتیٔ طبع اور سعادت فطری کی بنا پر بلا کسی پس و پیش کے اسلام قبول کر لیا۔

آپ دنیا کے ان چار خوش قسمت اور تاریخی شخصیتوں میں سے تھے جنہیں سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر لبیک کہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یعنی حضرت خدیجہ، حضرت ابو بکر، حضرت علی اور حضرت زید بن حارث (رضی اللہ عنہم)

نُصرتِ اسلام

قبولِ اسلام کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر اگرچہ

بہت کم تھی مگر اس چھوٹی سی عمر میں بھی خدمتِ اسلام کا شعور آپ میں پوری طرح پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغِ اسلام کے لئے تشریف لے جاتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ جاتے۔ اور حضور کے طرزِ تبلیغ کا بڑے غور سے مشاہدہ کرتے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانۂ کعبہ میں مصروفِ عبادت ہوتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بُتوں کے ہاتھ پیر اور سر توڑ کر انہیں عیب دار کرنے میں مصروف ہوتے۔ حالاں کہ آنحضرت نے انہیں کبھی اس قسم کی ہدایت نہیں فرمائی۔ مگر خود ان کی فطرت میں بتوں سے نفرت کا جذبہ موجزن رہتا تھا۔ یہ اسی جذبہ کی کارفرمائی کے مظاہر تھے۔

بعثتِ نبوی کے چوتھے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ اپنے رشتہ داروں کو دعوتِ اسلام دیجیے۔ چنانچہ آپ نے ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں اپنے قریبی رشتہ داروں کو مدعو کیا۔

اس دعوت میں بنو ہاشم کے چالیس افراد شریک ہوئے

ان لوگوں میں حضرت حمزہ، حضرت عباس، ابولہب اور ابو طالب کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس دعوت کا انتظام آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا۔ چودہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے اس صغر سنی کے باوجود انہوں نے بڑے سلیقے سے اس تقریب کا اہتمام کیا اور بکری کے پایوں اور دودھ سے شرکائے دعوت کی تواضع کی۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ کھانے سے فراغت کے بعد حاضرین سے خطاب فرمائیں۔ مگر اس شب ابولہب نے (غالباً شراب میں مخمور ہونے کی وجہ سے) اس قدر بیہودہ گفتگو کی کہ آپ کو تقریر کرنے کا موقع نہ ملا۔ دوسری شب پھر اسی قسم کی ایک دعوت کیا گیا اور جب سب لوگ کھانا کھا چکے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے اہلِ مجلس! میں آپ لوگوں کے لئے دُنیا و آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں اور میں نہیں سمجھتا کہ سارے عرب میں کوئی شخص اس سے بہتر اور افضل چیز اپنی قوم کے لئے لایا ہو۔ خدا تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ لوگوں کو بھی

اس کی طرف بُلاؤں۔ بتائیے آپ میں سے کون میرا ساتھ دے گا"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تقریر سُن کر ہر طرف سکوت طاری ہوگیا۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ ہاں ایک نوجوان کھڑا ہوا اور آپ کو مخاطب کر کے اعلان کیا کہ حضور میں حاضر ہوں۔

یہ جرأت مندانہ آواز حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ اعلان سُن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کی طرف دیکھا اور اُن سے کہا کہ آپ اس کی بات سُنا کیجئے اور یہ جو کہے اسے مان لیا کیجئے۔ یہ سُنتے ہی لوگ قہقہے لگانے لگے اور بعض لوگوں نے ازراہِ تمسخر ابو طالب سے کہا کہ لو آج سے تم اپنے بیٹے کا حکم مانو کرو۔

جاں نثاری

اس تقریب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جاں نثاری کا جو اعلان فرمایا تھا بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ اعلان کسی وقتی جذبے کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے آپ کا شعورِ آگہی

اور اسلام کی وہ صداقت بول رہی تھی جو آپ کے دل میں پوری طرح گھر چکی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد ہجرت سے لے کر جنگِ حنین تک ہر صبر آزما مرحلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار، آبدار اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و خدمت میں بے نیام ہوتی رہی۔ سوائے ایک جنگ کے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر مدینہ میں قیام کرنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ باقی ہر جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت کے ہمرکاب رہے۔ اور ان جنگوں میں آپ سے شجاعت و جانثاری کے وہ حیرت انگیز کارنامے ظہور میں آئے جن کی بنا پر آپ کا نام شجاعت کا نشان قرار پاگیا۔ اور آپ کی ضربِ حیدری ضرب المثل بن گئی۔

عرب کے بڑے بڑے سورما جن میں سے ایک ایک شخص ننانوے ہزار کے برابر سمجھتا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شمشیرِ خارا شگاف سے مولی گاجر کی طرح کٹ کٹ کر ڈھیر ہو گئے۔ وہ بڑے بڑے معرکے جو کسی سے سر نہ ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بے مثال شجاعت اور جنگی مہارت سے یوں فتح کر لئے جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ بعض خون ریز معرکوں

میں بڑے بڑے جی دار لوگ میدان چھوڑ گئے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام ان چند نفوس میں ہمیشہ سرفہرست رہا۔ جنہوں نے اپنے پیارے آقا کو کسی حالت میں کبھی تنہا چھوڑنا گوارا نہ کیا۔

تفویضِ منصب

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ان عظیم الشان خدمات کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضور نے اپنے خاندان کے لوگوں کو سرکاری مناصب سے بہت دُور رکھا۔ حالانکہ بنو ہاشم میں بڑے بڑے بہادر، عقل مند اور فہم و فراست والے لوگ موجود تھے مگر آپ نے ان میں سے کسی کو کوئی عہدہ نہ دیا۔ صرف ایک مثال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہے کہ آپ نے انہیں متعدد مناصب پر فائز کیا۔

چنانچہ آپ صوبہ یمن کے سب سے پہلے چیف جسٹس مقرر کئے گئے۔ اس کے بعد آپ کو اسی صوبہ کا وزیر مال مقرر کیا گیا اور عرصہ دراز تک آپ اس منصب پر فائز رہے۔ اس سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حضرت علی کو یمن کی مہم پر ایک لشکر کا قائد بنا کر بھیجا۔ پھر مزید کمک کے طور پر ایک لشکر حضرت

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں روانہ فرمایا اور انہیں ہدایت کی کہ جب تم اور علی (رضی اللہ عنہ) اکٹھے ہو جاؤ تو سردار علی (رضی اللہ عنہ) ہوں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک حضرت علی کا مرتبہ کتنا اونچا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جہاد بالسیف (تلوار) کے علاوہ جہاد بالسان (زبان) یا تبلیغ اسلام کے سلسلے میں بھی بڑے گراں قدر کارنامے سرانجام دیئے اور ان کا آغاز بھی اسی صوبہ یمن سے ہوا۔

چنانچہ تاریخ میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو تبلیغ اسلام کے لئے یمن بھیجا۔ حضرت خالد (رضی اللہ عنہ) چھ ماہ تک نہایت محنت و اخلاص سے تبلیغ میں کوشاں رہے۔ مگر اتفاق کی بات کہ انہیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا۔ اور اپنے دستِ مبارک سے ان کے سر پر عمامہ باندھ کر انہیں یمن روانہ فرمایا۔ اور دعا فرمائی کہ اے اللہ تعالیٰ علی (رضی اللہ عنہ) کی زبان میں تاثیر عطا فرما

مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے ایسی تاثیر عطا فرمائی کہ ان کے یمن پہنچتے ہی اہلِ یمن حلقۂ بگوشِ اسلام ہونے لگے۔ اور ایک قبیلہ جو ہمدان کے نام سے مشہور تھا سارا ہی کا سارا مسلمان ہو گیا۔

وصالِ نبوی کے بعد

سالھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا اور مسلمانوں نے متفقہ طور پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کر دیا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت ابو بکر کی بیعت کر لی اور آپ کے سوا دو سالہ عہدِ خلافت میں ان کے رفیق و مشیر رہے۔ جب باغیوں کی طرف سے مدینہ پر حملہ کا اندیشہ ہوا اور حضرت ابو بکر نے مسلمانوں کو مدینہ کی حفاظت پر مقرر کیا تو حضرت رضی اللہ عنہ مجاہدین کے ایک دستے کی قائد کی حیثیت سے مدینہ کے ایک اہم ناکہ کی حفاظت پر مامور تھے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بلا پس و پیش ان کی بھی بیعت کر لی۔ اور آخر وقت تک ان کے ہمدم و

ہمراز رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جو اعتماد تھا اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ واقعہ کافی ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس روانہ ہوئے تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا قائم مقام مقرر کیا۔

اس کے علاوہ ہر مشکل مرحلے میں حضرت عمر نے حضرت علی سے رائے لی۔ اور حضرت علی نے انہیں مشورے دینے میں کبھی بُخل سے کام نہیں لیا۔ حضرت علی کے یہ مشورے اتنے درست ہوتے تھے کہ ایک بار حضرت عمر کہہ اُٹھے تھے کہ "خدا کی قسم اگر علی (رضی اللہ عنہ) نہ ہوتے تو عمر (رضی اللہ عنہ) ہلاک ہو گیا ہوتا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُسی وقت اُن کی بھی بیعت کر لی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی پہلے دو خلفاء کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تعاون حاصل رہا۔ جب ایک منظم سازش کے تحت کوفہ، بصرہ اور مصر کے باغیوں نے مدینہ آ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اپنی شکایات بیان کیں تو حضرت علی (رضی اللہ عنہ) ہی تھے جنہوں نے سمجھا بجھا

کر ان فسادیوں کو واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ پھر جب دوسری بار ان لوگوں نے مدینہ آکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان کا محاصرہ کیا تو اس موقع پر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی نے اپنے اثر و نفوذ سے کام لے کر باغیوں کو واپس کر دیا۔ تیسری بار ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر سختی شروع کی تو اس موقع پر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خدمات پیش کیں۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان تمام صحابہ کو جو خلیفۃ المسلمین کی مدافعت میں اپنی تلواریں بے نیام کرنا چاہتے تھے سختی کے ساتھ خونریزی کرنے سے منع کر دیا۔

مجبوراً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گھر بیٹھنا پڑا اور پھر وہ المناک اور لرزہ خیز واقعہ پیش آیا جس نے حضرت عثمان ہی کی جان نہیں لی بلکہ اُمّتِ محمّدیہ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے بھی تلوار سے دو ٹکڑے کر دیئے۔

مسندِ خلافت پر

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت جن جیّد صحابہ اور مدینہ کے ممتاز افراد کی بیعت سے

منعقد ہوئی۔ ایک مستند مؤرخ نے ان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یوم جمعہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ ہجری کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کئے گئے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ ان بیعت کرنے والوں میں حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل، عمار بن یاسر، اسامہ بن زید، سہیل بن حنیف، ابوایوب انصاری، محمد بن مسلمہ، زید بن ثابت، خزیمہ بن ثابت (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) اور وہ تمام صحابہ شامل تھے جو اس وقت مدینہ میں موجود تھے۔"

جس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے، وہ اسلام کا نازک ترین وقت تھا۔ اُمّتِ مسلمہ متعدد گروہوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک طرف بنواُمّیہ امیر معاویہ کے پرچم تلے جمع ہو کر مظلوم خلیفہ کا قصاص طلب کر رہے تھے، تو دوسری طرف حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بعض لوگوں کے بھڑکانے کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہو کر بصرہ پہنچ چکی تھیں۔

تیسری طرف مسلمانوں کی اکثریت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں خلافت حقّہ کو مستحکم کرنے کا عہد کر چکی تھی۔ ان حالات میں بڑے تدبّر و فراست اور دُور اندیشی کی ضرورت تھی۔

تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان اُلجھے ہوئے حالات کو سُلجھانے کے لئے اپنی غیر معمولی بصیرت، ثابت قدمی اور استقلال کا مظاہرہ کیا۔ اور ایک ایک کر کے ساری رکاوٹوں کو دُور کر دیا۔

سب سے پہلے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے زبردست لشکر کو شکست دی اور بصرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ حضرت معاویہ کی طرف متوجہ ہوئے اور جہاں تک تلوار کی جنگ کا تعلق ہے انہیں شکست دی اور حضرت معاویہ نے مصالحت کی پیش کش کر دی۔

تیسری طرف انہوں نے نہروان کی جنگ میں خارجیوں کو شکست دے کر ان کا قلع قمع کر دیا۔ ان جنگوں سے فراغت پانے کے بعد انہوں نے ملک کے نظم و نسق کی اصلاح کی جانب توجہ دی۔ چھاؤنیوں اور قلعوں کو مستحکم کیا۔ بعض نئے قلعے اور چھاؤنیاں تعمیر کروائیں۔

ان خانہ جنگیوں کے دوران میں خراسان کے جن غیر مسلم سرداروں

نے بغاوت کر کے متعدد علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا، آپ نے آزمودہ کار فوجوں کے دستے بھیج کر ایک ایک کو شکست دی اور ان علاقوں کو دوبارہ اپنی حکومت میں شامل کیا۔ نظام سلطنت میں متعدد اصطلاحات کیں اور جہاد کی غرض سے دو لشکر سندھ اور کوکن علاقہ ممبئی کی طرف روانہ کیئے۔ ان دونوں لشکروں کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔

انتقال سے پہلے کچھ عرصہ آپ نے چالیس ہزار بہادروں کا ایک لشکر مرتب کیا، جو مارنے مرنے کی قسمیں کھا چکا تھا۔ آپ کا ارادہ تھا کہ اس لشکر کو ہمراہ لے کر امیر معایہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک فیصلہ کُن جنگ کریں۔ اور یقین تھا اگر یہ جنگ برپا ہو جاتی تو شام اور مصر کے باغی صوبوں پر بھی آپ کا تسلط قائم ہو جاتا اور دنیا ایک بار پھر مثالی حکومت کا نظارہ دیکھ لیتی۔ مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا اور پیشتر اس کے کہ آپ یہ لشکر لے کر شام کی طرف روانہ ہوتے ایک بد بخت عبدالرحمٰن ابن ملجم خارجی کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ (یہ واقعہ ۱۹ رمضان ۴۰ھ کو پیش آیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ ۝

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت

حضرت علی رضی اللہ عنہ تاریخِ اسلام کی ان چند خاص شخصیتوں میں سے تھے جنہیں جامع الصفات کہا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف میدانِ شجاعت کے مرد تھے تو دوسری طرف علم و فضل میں باکمال تھے، انہوں نے نوجوانی کی عمر سے لے کر بڑھاپے تک بیسیوں معرکوں میں حصّہ لیا اور ہر معرکے سے کامیاب واپس آئے۔ گھمسان کی جنگ میں بھی ان کے پاؤں میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ اور انہوں نے کبھی پیٹھ نہیں دکھائی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصّہ حضور کی خدمت میں گزارا اور حضور ہی نے ان کی تعلیم و تربیت فرمائی۔

یہی وجہ ہے کہ وہ علمِ دین کے بہت بڑے ماہر تھے اور قرآنِ کریم کی تفسیر کے باریک سے باریک نکات سے واقف تھے۔ کتنی ہی آیتیں اور سورتیں اُن کی موجودگی میں نازل ہوئیں۔ اور بقول اُن کے وہ قرآنِ کریم کی ہر آیت اور ہر سورت کی شانِ نزول سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے جج تھے اور ان سے زیادہ صحیح فیصلہ کرنے والا اُن کے بعد کوئی پیدا نہیں ہوا۔ ان کے بعض فیصلے آج بھی قانون کی کتابوں

میں درج ہیں۔ اور یورپ کے بڑے بڑے ماہرین قانون اور جسٹس انہیں حوالے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کی دستارِ فضیلت زہد و تقویٰ کے چمکدار موتیوں سے بھی مزین تھی۔ یہ تقویٰ ان کی ذاتی زندگی سے لے کر خلافت و سیاست تک ہر شعبے میں کارفرما تھا۔

وہ خود بھی بہت کم اور سادہ خوراک استعمال کرتے تھے موٹا جھوٹا لباس پہنتے تھے اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے مگر انہیں خلافت کے لئے جو زمانہ ملا تھا وہ اس زہد و تقویٰ کیلئے سازگار نہ تھا۔ ان کے زمانے کے لوگ عہدِ رسالت کے لوگوں کی طرح مزاج میں غنی اور قناعت پسند نہ تھے، اُن کا دینی معیار اس عہدِ مبارک کے لوگوں کی طرح بلند نہ تھا۔ اُن کا سابقہ جن لوگوں سے پڑا تھا وہ شام و عراق اور ایران جا کر وہاں کے لوگوں کی شان و شوکت اور عیش پرستیاں دیکھ آئے تھے۔ دولت کی ریل پیل نے ان کی آنکھوں میں حیرت پیدا کر دی تھی اور وہ بھی اسی انداز سے زندگی گزارنا چاہتے تھے لیکن انہیں جو خلیفہ ملا تھا وہ بیحد زاہد اور سخت گیر تھا۔ اور ایک درہم بھی غلط جگہ پر خرچ کرنا گوارا نہ کرتا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں جو فتنے رونما ہوئے،

ان کے طاقت پکڑنے کی ایک بڑی وجہ حاکم رعایا کے نظریات ومزاج کا یہ تضاد بھی تھا۔ انہوں نے ایک موقع پر اپنے حریف امیرِ معاویہ سے اپنا مقابلہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ شاید لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے سیاست نہیں آتی۔ اور میں لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہوں۔ میں یہ سارے طریقے خوب جانتا ہوں لیکن میں اپنے مفاد کے لئے کبھی کوئی غلط کام نہیں کروں گا اور نہ لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے اللہ کی امانت (بیت المال) کو ناجائز طور پر خرچ کروں گا۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ چاہتے تو چالبازیوں سے کام لے کر اور سردارانِ قبائل کو رشوتیں دے کر بڑی آسانی سے اپنے ساتھ ملا لیتے۔ اور اس طرح خراب حالات سازگار ہو جاتے۔ مگر سیاست کا یہ گھٹیا کھیل وہ اسلامی تعلیم اور اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ وہ تو ایک ننگی تلوار کی مانند تھے اور وہی کرتے اور کہتے تھے جو حق ہوتا تھا۔

وہ ہر معاملے کو اسلام کے اصول کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ اور خدائی احکام کو نافذ کرانے میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ ایک بار جب وہ یمن کے وزیر مال کے منصب جلیلہ پر فائز تھے تو بعض لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی شکایت

کی۔ یہ شکایت کچھ قیمتی کپڑے کے متعلق تھی۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نائب نے آپ کی اجازت کے بغیر فوج میں تقسیم کر دیا تھا۔ چونکہ یہ بیت المال کی ملکیت تھی اس لئے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے یہ کپڑا اُن لوگوں سے واپس لے کر مقامی بیت المال میں جمع کرا دیا۔ فوج کے بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس سلوک کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا کہ:

"اے لوگو! علی (رضی اللہ عنہ) کی شکایت نہ کیا کرو وہ خدائی احکام کے بارے میں بہت سخت واقع ہوئے ہیں"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذاتی زندگی بھی بڑی پاکیزہ تھی اور ان کے اخلاق و عادات مثالی تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی اور آپ کے داماد تھے۔ حسب و نسب کے لحاظ سے عرب کے ممتاز ترین فرد تھے اور اس وقت کی معلوم دنیا کے سب سے بڑے فرمانروا تھے۔

مگر اس کے باوجود اُن کے مزاج میں انتہا درجہ کی انکساری تھی۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ اپنا سودا بازار سے خود خرید کر لاتے تھے۔ اپنی جوتی خود سیتے تھے۔ ظاہری شان و

شوکت سے انہیں بے حد نفرت تھی ۔ بازار سے گزرتے ہوئے جب کبھی لوگ ازراہِ تعظیم ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگتے تھے تو انہیں یہ کہہ کر روک دیتے تھے کہ میرے پیچھے مت چلو۔ اس قسم کے امُور والی کو فتنے میں ڈال دیتے ہیں۔ (یعنی اس میں تکبّر پیدا ہو جاتا ہے)۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب مسند میں ایک روایت درج کی ہے کہ ایک روز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھ پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھُوک کی شدّت کی وجہ سے پیٹ پر پتھّر باندھے رکھتا تھا اور آج (میری دولت) کا یہ حال ہے کہ صرف چالیس ہزار رقم تو میں زکوٰۃ کے طور پر ادا کرتا ہوں۔

لیکن اس قدر مال دار ہونے کے باوجود آپ کا حال یہ تھا کہ عام طور پر جَو کی روٹی اور سرکہ اور کبھی کبھار گوشت آپ کے دسترخوان پر ہوتا تھا۔ بعض دفعہ پیالے میں ستو ڈال کر انہیں پانی میں ملا کر پی لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی ساری دولت فقراء، معذوروں، یتیموں اور بیواؤں پر صرف ہوتی تھی اور آپ کے نزدیک مال کا بہترین مصرف یہی تھی۔

حضرت علی ۳۵ھ ہجری میں خلیفہ ہوئے اور ۴۰ھ ہجری میں شہید ہو گئے۔ آپ نے تقریباً پونے پانچ سال خلافت کی۔ ۶۳ سال کی عمر پائی۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد مختلف اوقات میں آٹھ شادیاں کیں۔ اکتیس اولادیں ہوئیں۔ جن میں چودہ لڑکے اور سترہ لڑکیاں تھیں۔ آپ کی اولادوں میں حضرت امام حسن، حضرت امام حسین اور حضرت زینب (رضی اللہ عنہم) نے بڑی شہرت پائی۔

اس وقت آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی زندگی اور شخصیت کا تذکرہ ہمارے پیشِ نظر ہے اور آئندہ صفحات میں ہم اسی موضوع پر روشنی ڈالیں گے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ

بن

علی رضی اللہ عنہ

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ

ایک نہایت رُعب دار اور مردانہ حُسن کا پیکر، کھجوروں کے باغ کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے ایک حبشی غلام کھانا کھا رہا ہے۔ قریب ہی ایک کُتا کھڑا ہے۔ غلام ایک لقمہ خود کھاتا ہے اور دوسرا کُتے کے آگے ڈال دیتا ہے۔ اس طرح اس نے نصف روٹی خود کھائی اور نصف کُتے کو کھلا دی۔

یہ منظر دیکھ کر آپ نے اس غلام سے پوچھا کہ تو نے کُتے کو بھگا کیوں نہ دیا۔ غلام نے جواب دیا کہ "میری آنکھوں کو اس کی آنکھوں سے حجاب آیا۔"

اس حسین مرد پر غلام کا جواب سُن کر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور اس نے غلام سے اس کا نام اور پتہ دریافت کیا۔ غلام نے بتایا کہ میں آبان بن عثمان رضی اللہ عنہ کا غلام ہوں۔ پوچھا

یہ باغ کس کا ہے۔ کہنے لگا کہ باغ بھی انہیں کا ہے۔ یہ سُن کر اُس بارُعب شخص نے غلام سے کہا کہ میری واپسی تک کہیں نہ جانا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے واپس آکر غلام سے کہا کہ میں نے تمہیں تمہارے آقا سے خرید لیا ہے۔ یہ سن کر غلام بطورِ تعظیم کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں جو حکم ہو۔

اس پر اس شخص نے کہا کہ یہ باغ بھی میں نے خرید لیا ہے۔ میں تم کو راہِ خدا میں آزاد کرتا ہوں اور یہ باغ تمہارے نام ہبہ کرتا ہوں۔ غلام یہ سُن کر پیروں پر گر پڑا۔ (ابنِ عساکر جلد چہارم

ولادت

یہ نکتہ شناس اور ادا نواز شخص حضرت حسن بن علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) تھا۔ حسن بن علی رضی اللہ عنہ جو حضرت امام حسن (رضی اللہ عنہ) کے پُرعظمت اور مقدس نام سے مشہور ہیں آپ ۱۵ رمضان ۳ھ ہجری کو مدینہ میں پیدا ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی پیدائش کی خبر دی گئی۔ آپ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لائے۔

نومولود کو ایک سپید کپڑے میں لپیٹ کر حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اسے گود میں لیا اور پوچھا اس کا کیا نام رکھا ہے۔ بتایا گیا کہ حرب، آپ نے فرمایا کہ نہیں اس کا نام حسن رکھو۔ پھر حکم دیا کہ ساتویں روز اس کا عقیقہ کرنا اور جانور ذبح کر کے بچے کے بالوں کے ہم وزن چاندی خیرات کر دینا۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ساتویں دن اس بچہ کا عقیقہ کیا گیا اور دو مینڈھے ذبح کر کے ان کا گوشت کچھ خیرات کیا گیا اور کچھ مدینہ کے مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا۔

بچپن اور تعلیم و تربیت

اس امر میں کسی شک وشبہ کی بالکل گنجائش نہیں کہ تعلیم و تربیت اور پرورش کرنے کے لئے جو عظیم المرتبت ہستیاں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو میسّر آئیں وہ اس روئے زمین پر اور کسی کو نہ مل سکیں۔

وہ ایک ہی وقت میں حضرت فاطمہ، حضرت علی (رضی اللہ عنہ) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر تربیت رہے، جو بہترین انسان تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ان کی تربیت

کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں تعلیم دی۔ وہ وقتاً فوقتاً آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے اور حضور انہیں بہترین اخلاق کی تعلیم دیتے۔ ان کی عادات کو سنوارتے اور ان کے طور طریقوں کی نگرانی فرماتے۔

چنانچہ ایک روز کا واقعہ ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے اور بچپن کی وجہ سے برتن میں ہاتھ ڈال کر ترکاری کے ٹکڑے جہاں نظر آتے نکال کر کھاتے جاتے۔ حضور نے فوراً انہیں ٹوکا اور فرمایا کہ: "بیٹے! سالن اپنے آگے سے کھاتے ہیں"۔

ایک بار حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ کہنے لگے نانا جان! ہم دونوں کشتی لڑتے ہیں، آپ فیصلہ کیجیے کہ کون طاقت ور ہے۔ آپ نے فرمایا "اے عزیزو! آپس میں کشتیاں لڑنا تمہارے حسبِ حال نہیں ہے، لکھنے کی مشق کیا کرو"۔ اکثر اوقات مسجد میں بھی آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے اور آپ کے ساتھ ہی نماز ادا کرتے۔

مسجد نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات سننے اور

آپ کی پاکیزہ مجلس میں شریک رہنے کی وجہ سے بچپن ہی سے آپ کو علم دین سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اور آپ کے اخلاق و عادات پاکیزہ سانچے میں ڈھل گئے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے بچپن کے واقعات میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا جس سے معلوم ہو کہ آپ نے اپنے ساتھ کھیلنے والے بچّوں کے ساتھ کبھی سخت کلامی یا ان پر زیادتی کی ہو۔ انہوں نے کبھی فضول مشاغل میں بھی حصہ نہیں لیا۔ البتہ اپنے ہم جولیوں کے ساتھ تیر اندازی کے مقابلوں میں شرکت کرنے کے واقعات ملتے ہیں۔ نیزہ بازی اور شہسواری کا بھی آپ کو بچپن ہی سے شوق تھا۔ اور ان فنون میں آپ کو بڑی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و محبّت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے جو غیر معمولی محبت تھی اس سے کتبِ سیرت اور تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں، آپ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو دیکھنے اکثر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لاتے۔ ان کی ذرا ذرا سی تکلیف پر بے قرار ہو جاتے۔ ان کے لئے بارگاہِ الٰہی میں

دُعائیں فرماتے۔ کبھی اپنی پیٹھ پر بٹھاتے، کبھی کندھوں پر اُٹھاتے کبھی اپنے دونوں پیروں کے درمیان راستہ بناتے جس میں سے حسن (رضی اللہ عنہ) گزرتے اور آپ انہیں دیکھ دیکھ کر مسرور ہوتے۔ وقتاً فوقتاً آپ کی زبان مبارک سے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے لئے کلماتِ خیر نکلتے رہے۔ جن سے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی منزلت کا تعین ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک بار ارشاد فرمایا کہ حسن وحسین (رضی اللہ عنہم) مجھے اہلِ بیت میں سے زیادہ عزیز ہیں۔

ایک بار حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو آپ نے اپنے کندھا مبارک پر چڑھایا اور پھر فرمایا کہ "خداوند" یہ مجھے محبوب ہیں، پس تو بھی اسے محبوب رکھ۔"

مشہور صحابی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ ایک روز کا ذکر ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قنیقاع کے بازار سے واپس آرہا تھا کہ راستے میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مکان پڑا۔ چنانچہ آپ ان کے مکان میں تشریف لے گئے اور جاتے ہی دریافت فرمایا کہ حسن وحسین (رضی اللہ عنہم) کہاں ہیں؟ اتنے میں دونوں

آ گئے۔ اور آپ کو دیکھتے ہی فرطِ محبت سے لپٹ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا اور فرمایا کہ" اے خداوند تعالیٰ یہ مجھے محبوب ہیں پس تُو بھی انہیں محبوب رکھ اور انہیں بھی جو انہیں محبوب رکھتے ہیں"۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جس نے حسن و حسین رضی اللہ عنہم ، سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان سے عداوت رکھی اس نے مجھ سے عداوت رکھی۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اپنے زمانۂ خلافت میں ایک روز خطبہ پڑھ رہے تھے، کہ قبیلہ ازد شنوۃ کا ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ" میں شہادت دیتا ہوں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ؛حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ، انہیں گود میں لئے ہوئے فرما رہے تھے کہ جو شخص یہاں میری بات سُن رہا ہے وہ ان تک پہنچا دے جو یہاں نہیں کہ جو مجھے

محبوب رکھتا ہے وہ حسن (رضی اللہ عنہ) کو بھی محبوب رکھے"۔
اس کے بعد اس شخص نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر مجھے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کا خیال نہ ہوتا تو میں یہ بات نہ کہتا"

خلفائے راشدین کی شفقت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح آپ کے تینوں جانشینوں کا سلوک بھی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہایت مشفقانہ اور محبت آمیز تھا۔ خصوصاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو آپ سے بے حد محبت فرماتے تھے۔

چنانچہ ایک روز نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ راستہ میں امام حسن رضی اللہ عنہ کھیل رہے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں اٹھا کر کندھے پر بٹھا لیا اور فرمانے لگے بخدا یہ نبی سے مشابہ ہے علی (رضی اللہ عنہ) سے نہیں۔ حضرت علی حضرت ابوبکر کے اس محبت آمیز فقرے پر بہت مسرور ہوئے۔

ایک روز آپ (رضی اللہ عنہ) نے حضرت امام حسن کو دیکھ کر

فرمایا کہ اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ میں اپنے رشتہ داروں سے حسن سلوک کرنے سے کہیں زیادہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا پسند کرتا ہوں۔ مجھے اپنے اقارب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقارب عزیز ہیں۔

پھر ایک روز فرمایا کہ " اے اہلِ بیت نبوی ! اپنے رشتہ داروں سے زیادہ آپ لوگوں کے ساتھ صلۂ رحمی کرنا مجھے زیادہ محبوب ہے کیونکہ آپ لوگ رسول اللہ کے قریبی ہیں۔ اور آپ کو ساری دنیا کے مسلمانوں پر فضیلت حاصل ہے۔

حضرت ابو بکر کی طرح حضرت عمر بھی حضرت امام حسن (رضی اللہ عنہم) سے نہایت شفقت آمیز سلوک کرتے تھے اور اگر چند روز تک حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ آپ کی نگاہوں سے اوجھل رہتے تو انہیں بلواتے اور اپنے پاس بٹھا کر نہایت محبت آمیز گفتگو کرتے۔ کبھی فرماتے آپ مجھے اپنے بیٹوں سے زیادہ محبوب ہیں۔ کبھی فرماتے کہ فرزند رسول، فرزندِ عمر سے کہیں زیادہ معزز ہے۔

جب آپ نے بیت المال سے صحابہ کے وظائف مقرر

فرمائے تو باوجودیکہ بدر کے وقت حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے مگر حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے ان کا وظیفہ اتنا ہی مقرر فرمایا جتنا اصحابِ بدر کا تھا۔

میدانِ عمل میں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ پوری طرح جوان ہو چکے تھے۔ اسی عہد سے آپ کی عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے آپ نے طبرستان کی جنگ میں حصہ لیا۔ یہ جہاد ۳۰ھ میں ہوا اور سعید بن العاص اس مہم کے کمانڈر انچیف تھے۔

دوسرا واقعہ جس میں آپ کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مدافعت سے متعلق ہے۔ جب ملتِ اسلامیہ کے باغیوں اور فسادیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ اور اس قدر سخت ناکہ بندی کی کہ کھانے پینے کی کوئی چیز اندر نہیں جا سکتی تھی۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن ہی کے ہاتھوں پانی کا ایک مشکیزہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے بھیجا تھا۔

پھر ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے بھی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں کھانے پینے کی بعض اشیاء حضرت عثمان کی خدمت میں بھجوائی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بھی حضرت عثمان کی امداد کرتی تھیں۔ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہی ان کے گھر سے کھانا اور پانی لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر لے جایا کرتے تھے۔

اصحابِ مدینہ کے جن فرزندوں نے اس محاصرے کے دوران میں شب و روز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان کا پہرہ دیا ان میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے اور جب باغیوں نے مکانِ عثمان رضی اللہ عنہ میں طاقت کے زور سے داخل ہونے کی کوشش کی تو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے دوسرے محافظین کی معیت میں بڑی شدت سے جنگ کی اور باغیوں کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

اس مزاحمت میں آپ کے جسم پر کئی زخم بھی آئے لیکن خدا کی مرضی پوری ہو کر رہی اور ادھر سے ناکام ہونے کے بعد باغی پشت کی طرف سے مکان میں داخل ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو

شہید کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو اس عہد میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی شخصیت کے نقوش پوری طرح اجاگر ہونے لگے۔ اس عہد میں آپ ہمیں سب سے پہلے کوفہ کی جامع مسجد میں نظر آتے ہیں۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ مسندِ نشین خلافت ہونے کے بعد جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ بنو امیہ کے مفرور افراد نے مکہ پہنچ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھڑکایا ہے اور ان کے سامنے معاملے کا غلط رُخ پیش کیا ہے۔ جس سے متاثر ہو کر وہ ایک لشکر کے ہمراہ بصرہ پہنچ چکی ہیں۔ پھر اس کے بعد ہی انہیں یہ خبر ملی کہ ان کی فوج نے بصرہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس خطرناک صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے ناگریز ہو گیا۔

چنانچہ انہوں نے عراق کی جانب کوچ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اہلِ کوفہ کو ایک خط لکھا۔ کیوں کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اگلا قدم کوفہ کی طرف اٹھنے والا ہے۔ اس خط میں انہوں

نے اہلِ کوفہ کو ان الفاظ میں مخاطب کیا۔

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمْ

"میں نے تمہیں لوگوں کو اپنے لئے منتخب کیا ہے اور تمہارے ہی پاس آکر قیام کروں گا۔ کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ تم خدا، رسُولِ خدا اور مجھ سے محبت کرتے ہو۔ یاد رکھو! میری تائید و نصرت کرنے والا حق و انصاف کی تائید و نصرت کرے گا۔ اور اس فرض سے عہدہ برآ ہو جائے گا جو اس کے ذمہ ہے۔"

اس خط کے بعد تھوڑا سا توقف کر کے آپ (رضی اللہ عنہ) نے اپنے معتمدین محمد بن ابو بکر اور محمد بن عوف کو جانب کوفہ بھیجا تاکہ وہ جا کر وہاں کے حالات کا جائزہ لیں۔ یہ اقدامات آپ نے مقام ربزہ میں کئے تھے جہاں آپ بصرہ جانے کے لئے لشکر مرتب فرما رہے تھے۔ یہیں سے آپ نے اہلِ مدینہ کے پاس اپنے قاصد بھیجے اور انہیں بھی تائید و مدد کی تحریک کی۔ اس تحریک کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور ہزاروں افراد کا ایک لشکر جرار آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گیا۔

اس فوج کو مخاطب کر کے آپ نے حسب ذیل تقریر کی:

اما بعد! اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کے ذریعہ معزز

کیا۔ ہمارا درجہ بلند کیا۔ ہمیں رسوائی اور نفرت و عناد سے نجات دے کر ایک دوسرے کا بھائی بنایا۔ جب تک خدا تعالیٰ کی مرضی تھی لوگ اتفاق و اتحاد کی راہ پر گامزن رہے۔ انہوں نے اسلام کی پیروی کی۔ حق ان میں موجود رہا اور وہ کتابِ الٰہی کو اپنا راہ نُما بنائے رہے۔ حتیٰ کہ بعض فتنہ کھڑا کرنے والے لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں شیطان نے اُمّتِ محمدیہ میں نفاق و انتشار پیدا کرنے کے لئے اپنے پیچھے لگایا تھا۔ یہ لازمی بات ہے کہ یہ اُمّت بھی اسی طرح اختلاف و انتشار میں مبتلا ہو جس طرح پچھلی اُمّتیں اس کا شکار ہوئیں۔ ہم خدا تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اس فتنہ انگیزی سے جس کے آئندہ رونما ہونے کا امکان ہے لیکن جو کچھ پیش آنا ہے وہ پیش آ کر رہے گا، اور اُمّتِ محمدیہ کے تہتّر (۷۳) فرقے ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔ اس وقت تک جو کچھ ہوا وہ تم دیکھ چکے ہو۔ پس تم اپنے دین پر سختی سے قائم رہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی راہ پر

گامزن ہو جاؤ۔ سنّتِ رسُول کی اتباع کرو۔ جب کوئی دشواری پیش آئے تو قرآن کی طرف رجوع کرو۔ جس چیز کی قرآن تائید کرے اسے اختیار کرو اور جس چیز کی تردید کرے اس سے بچو۔ خدا کے رب العالمین ہونے پر، اسلام کے دین حق ہونے پر، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رسول ہونے پر اور قرآنِ حکیم کے حکم و عدل ہونے پر رضا مند رہو۔"

•

اس تقریر سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جانثاروں میں ایک عجیب جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا۔ اور وہ مارنے مرنے پر تیار ہو گئے۔ اِدھر سے مطمئن ہونے کے بعد آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور مالک اشتر کو کوفہ جانے کا حکم دیا۔ کیوں کہ آپ نے اس سے پہلے اپنے جن معتمدین کو کوفہ بھیجا تھا، انہوں نے واپس آکر اطلاع دی کہ کوفہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری اپنی امن پسندی کی وجہ سے لوگوں کو گھروں میں بیٹھ رہنے کی تلقین کر رہے ہیں۔

مگر حضرت ابنِ عباس اور مالک اشتر کو بھی اس مشن میں ناکامی ہوئی۔ کیوں کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے

اپنی یہ رائے تبدیل کرنے سے انکار کر دیا کہ جب تک موجودہ فتنہ ختم نہ ہو جائے۔ اس وقت تک جنگ کے لئے نہیں نکلنا چاہیئے۔ انھوں نے اپنی سادگی کی بنا پر یہ نہ سوچا کہ فتنہ گھر میں بیٹھے بیٹھے تو ختم نہیں ہوگا۔ فتنہ کو ختم کرنے کے لئے تو گھر سے باہر نکلنا پڑے گا۔ اور یہی حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کا مقصد و مدعا تھا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ ایک مشن پر

بہرحال ابن عباس رضی اللہ عنہ اور مالک اشتر کی ناکام واپسی کے بعد آپ نے حضرت امام حسن اور مشہور صحابی حضرت عمّار بن یاسر رضی اللہ عنہم کو کوفہ کی جانب روانہ کیا۔ جس وقت یہ دونوں بزرگ کوفہ کی جامع مسجد میں داخل ہوئے تو کوفہ کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ منبر پر بیٹھے ہوئے حاضرین سے خطاب کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔

"لوگو! فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور جب فتنہ اٹھتا ہے تو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کدھر سے اٹھا ہے اور کس نے اٹھایا ہے۔ پس تم اپنی تلواروں کو نیام میں ڈال لو، اپنے نیزوں کے پھل توڑ ڈالو۔ اپنی کمانوں کے چلّے

اُتار دو اور گھروں میں بیٹھے رہو۔ اے لوگو! فتنہ کے ایّام میں کھڑے ہونے والے سے سونے والا اور چلنے والے سے کھڑا ہوا شخص بہتر ہے۔"

•

جب حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) اپنی تقریر ختم کر چکے تو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور السلام علیکم کہہ کر اُن سے فرمایا کہ آپ نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا ہے اگر آپ اپنی اس رائے پر قائم رہنے کا عہد کر چکے ہیں تو ہمیں بھی کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ فوراً منبر سے نیچے اُتر آئے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے ایک سرکردہ شخص قعقاع بن عمر کو حکم دیا کہ منبر پر جا کر حاضرین سے خطاب کریں۔ قعقاع نے مندرجہ ذیل تقریر کی:

"اے اہلِ کوفہ! حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنی تقریر میں جو باتیں کہیں وہ غلط نہیں ہیں لیکن اس پر بھی غور کرو کہ کیا ان باتوں سے زیادہ ضروری نظامِ خلافت کا قیام و استحکام نہیں ہے؟ اگر مرکز اور خلیفہ ہی موجود نہ ہو یا اگر

موجود ہو لیکن اسے استحکام نہ ہو تو ظالم سے انتقام کیونکر لیا جاسکتا ہے۔ اور مظلوم کی مدد کیسے کی جاسکتی ہے۔ اس طرح تو امن واماں اور نظامِ مملکت بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ مسلمانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کر لیا ہے، وہ تمہیں اصلاح کی جانب بُلا رہے ہیں۔ تمہیں ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے صدقِ دل سے ان کی تائید و نصرت کے لئے کمر بستہ ہو جانا چاہیئے۔

•

قنقاع کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے شہرۂ آفاق فیاض حاتم طائی کے بیٹے عدی کو اور پھر حجر بن عدی کو کھڑا کیا۔ ان لوگوں نے بھی بڑی مدلل اور جوشیلی تقریریں کیں۔ آخر میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امداد پر آمادہ کرنے کے لئے حسبِ ذیل تقریر کی۔

"اے لوگو! حضرت علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ تمہارے ہادی اور امام ہیں جن کے باغی لوگ صف آراء ہو گئے ہیں۔ اور اس خلیفۂ حق کے درپے آزار ہیں۔ یہ علی الاعلان گناہ کا ارتکاب کر رہے

ہیں، امام وقت کی بیعت تم پر واجب ہے اور اس کی اطاعت کرنا تمہارے لئے فرض ہے، اس لئے کمر باندھو اور اس کی امداد کے لئے روانہ ہو جاؤ۔ ایک دوسرے کا انتظار نہ کرو، ہر شخص اپنے اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔"

•

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور آپ کے رفقاء کی یہ تقریریں بہت مؤثر ثابت ہوئیں۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے اور لوگ جوق در جوق ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ مسجد سے اٹھے اور اپنے گھر جا کر خانہ نشین ہو گئے اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ ساڑھے نو ہزار کوفیوں کا لشکر جرار لے کر ذی وقار کی طرف روانہ ہو گئے، جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ مقیم تھے۔

اس لشکر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بڑی بے جگری سے جنگ کی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لشکر کو شکست دی۔ اس جنگ میں بھی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ

نے نمایاں حصّہ لیا اور بڑی بہادری سے ایک دستے کی قیادت کی۔ جنگ جمل کے بعد جب صفین کا معرکہ گرم ہوا تو اس معرکے میں بھی آپ نے اپنے پدرِ گرامی کے ہمرکاب دادِ شجاعت دی۔ تاریخ میں آتا ہے کہ اس جنگ میں آپ امدادی دستے کے قائد تھے اور جس محاذ پر فوج علوی میں کمزوری کے آثار ہونے لگتے آپ اپنے دستے کو لے کر بارش و بجلی کی طرح اس طرف جھپٹتے تھے اور اس شدت سے حملہ کرتے تھے کہ دشمن کا لشکر شکست کھا کر فرار ہو جاتا تھا۔

جنگِ صفین کے بعد جنگ نہروان میں بھی آپ نے حصّہ لیا اور اس جنگ میں بھی کامیابی نے آپ کے قدم چومے۔

خلافتِ علوی میں آپکی ذمہ داریاں

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی ان کا پوری طرح اندازہ تھا۔ چنانچہ آپ نے مُلک و ملّت کے لئے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع دیا اور اپنے عہدِ خلافت میں انہیں مختلف مناصب پر فائز کیا۔ اس عہد میں جو ذمہ داریاں آپ کے سپرد کی گئی تھیں ان میں سے چار ذمہ داریوں کے متعلق تاریخ سے

روشنی پڑتی ہے۔

پہلی ذمہ داری قضاء (عدلیہ) سے متعلق تھی اور موجودہ اصطلاح میں آپ کو چیف جسٹس آف سپریم کورٹ کہنا چاہیئے۔ یعنی سلطنت کے مختلف علاقوں کے قاضیوں کی عدالتوں میں جو مقدمات پیش ہوتے تھے اور اہلِ مقدمہ ان کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں کرتے تھے۔ ان تمام اپیلوں کی سماعت حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ذمہ تھی۔ اور آپ کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوتا تھا۔

اس منصب کی ذمہ داریوں کو آپ نے جس خوش اسلوبی سے ادا کیا اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ امر کافی ہے کہ آپ کے فیصلوں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ اطمینان کا اظہار کیا۔ اور ایک بار فرمایا کہ جس طرح حسن (رضی اللہ عنہ) فیصلے کرتا ہے اس طرح کے فیصلے سوائے میرے اور کوئی نہیں کر سکتا۔

آپ کی دوسری ذمہ داری گورنروں، محکمہ مال کے افسروں اور ضلعی حکام کے طور طریقوں کی نگرانی کرنا تھی۔ مملکت کے مختلف علاقوں سے حکام کے خلاف جو شکایتیں موصول ہوتی تھیں ان کی تحقیقات کے لئے آپ ہی کمیشن مقرر فرماتے تھے اور تحقیقاتی رپورٹ پر مناسب فیصلہ کرتے تھے۔ بعض امور کی جانچ پڑتال آپ

بذاتِ خود فرماتے تھے اور کبھی کبھی تحقیق حال کے لئے ان علاقوں میں بھی جاتے تھے جہاں یہ شکایتیں پیدا ہوتی تھیں۔

آپ کی تیسری ذمہ داری مرکزی وزیرِ مال کی تھی۔ بیت المال آپ ہی کی تحویل میں رہتا تھا۔ آپ ہی کی زیرِ نگرانی انصار ومہاجرین اور تمام مسلمانوں کو ان کے وظائف تقسیم کئے جاتے تھے۔ دوسرے صوبوں سے خراج کی جو رقوم وصول ہوتی تھیں، بیت المال کا عملہ آپ ہی کی زیرِ نگرانی ان کا حساب کتاب رکھتا تھا۔

آپ کی چوتھی حیثیت افسرِ مہمان نوازی کی تھی۔ ممالک غیر اور اندرون ملک کے جو سرکاری اور غیر سرکاری وفود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آتے تھے۔ ان کے قیام وطعام اور آرام و آسائش کا انتظام آپ ہی کے ذمہ تھا۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے ان فرائض کو نہایت جانفشانی اور کمال درجہ کی قابلیت سے ادا کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پونے پانچ سالہ عہد خلافت میں ان کے مشیر کار اور دست و بازو بنے رہے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی ان گراں قدر خدمات کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے بے حد خوش تھے اور یوں بھی واقعات وحالات سے ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد میں اپنے بڑے فرزند سے زیادہ محبت فرماتے تھے۔ وقتاً فوقتاً انہیں ملکی اور انتظامی باریکیوں سے آگاہ کرتے اور مفید نصیحتیں فرماتے رہتے۔

اس سلسلے میں آپ کا وہ تاریخی وصیت نامہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جو آپ نے اپنی خلافت کے آخری ایام میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے نام تحریر فرمایا تھا۔ اس وقت آپ امورِ مملکت کی انجام دہی کے سلسلے میں کوفہ سے باہر گئے ہوئے تھے۔ چونکہ اس وصیت نامے کے مخاطب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ کتاب آپ ہی کی ذاتِ گرامی سے متعلق ہے۔ اس لئے اس کا یہاں درج کر دینا بے محل نہ ہو گا۔

یہ وصیت نامہ اخلاقی نکات، رموز و معارف، تجرباتِ دُنیا۔ اسرارِ حکمت اور تعلق باللہ کے لحاظ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شاہکار ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا کہ ارشاداتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ اسلامی لٹریچر کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

•

وصیّت نامہ

"اے میرے بیٹے!

گردشِ ایّام، بے مہری دُنیا اور قُربِ آخرت نے مجھے ہر چیز سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اب عقبیٰ کی زندگی کے متعلق فکر و تردّد میرا دامن گیر ہے۔ اب مجھے ہر لمحہ اپنی آخرت کا خیال رہتا ہے۔ سارے پست و بلند میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ حقائق سے پردے اُٹھ چکے ہیں۔ سچّا معاملہ پیش نگاہ ہے پس یہی وجہ ہے کہ تیرے لئے میں نے یہ وصیّت لکھی ہے۔ خواہ میں زندہ رہوں یا وفات پا جاؤں۔ میرے اور تیرے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ تو میری روحِ حیات ہے۔ اگر تجھ پر کوئی مصیبت پڑے تو پہلے مجھ پر نازل ہو گی۔ تیری موت تیری موت نہیں میری موت ہو گی۔

میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ سے ڈرتا رہا کر اس کی ہدایت پر عمل پیرا رہا کر۔ اپنے دل کی دنیا کو ذکرِ الٰہی سے آباد رکھا کر۔ خدا کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑے رکھ کہ اگر تو غور کرے تو تیرے اور تیرے خدا کے درمیان جو رشتہ ہے اس سے زیادہ مضبوط رشتہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

وعظ و نصیحت سے اپنے دل کو زندگی بخش اور زاہدانہ قوتوں سے " اسے " (یعنی اس کی نفسانی اور ناجائز خواہشوں کو) ہلاک کر دے۔ یقین سے اسے تقویت دے، شمع حکمت سے اسے منور کر۔ موت کا ذکر کر کے اسے قابو میں لا۔ اس سے فنا ہو جانے کا اقرار کر۔ یادِ آلام سے اسے جھنجوڑ۔ نیرنگیٔ عالم سے اسے خوف زدہ کر۔ دنیا سے رخصت ہو جانے والوں کے واقعات اسے سنایا کر۔ پچھلوں کی بربادیوں کا ذکر کر کے اُسے آمادۂ عبرت کر۔ ان کی تباہ شدہ بستیوں سے گزر اور ان کے کھنڈرات دیکھ کر اپنے دل سے پوچھ کہ یہ لوگ کیا کرتے تھے۔ کدھر گئے؟ اس طریقے سے تجھ پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ وہ دوستوں اور عزیزوں کو چھوڑ کر چلے گئے اور ویرانوں کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اور تو بھی چند روز میں ان کے زمرے میں شامل ہو جائے گا۔

پس اپنی اصلاح کر۔ دنیا کے عوض آخرت کا سودا نہ کر۔ جس امر کے متعلق تجھے علم نہ ہو اس کے بارے میں خاموشی اختیار کر۔ بے فائدہ اور فضول گفتگو سے پرہیز کر۔ جس راستے میں گمراہ ہو جانے کا اندیشہ ہو اُسے اختیار نہ کر کہ مصائب و آلام میں مبتلا ہو جانے سے اچھا ہے کہ قدم اٹھایا ہی نہ جائے۔

نیکیوں کی تلقین کرتا رہا کر تاکہ تیرا شمار نیکوکاروں میں ہو۔

بدی سے اپنے ہاتھ اور زبان دونوں کو روک، بُروں سے کنارہ کشی اختیار کر۔ راہِ خدا میں اس طرح جہاد کر کہ جہاد کرنے کا حق ادا ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کے معاملات کسی ملامت کی پرواہ نہ کر۔ حق کی خاطر مصائب و آلام کے طوفانوں میں کود جا۔ دین میں بصیرت پیدا کر۔ ناپسندیدہ امور برداشت کرنے کی عادت ڈال قوتِ برداشت، انسانی قوتوں میں سب سے بہتر ہے۔ سارے کاموں میں اللہ تعالیٰ کو جائے پناہ بنا۔ اس طریقے سے تو ایسی پناہ گاہ میں چلا جائے گا اور ایسے مستحکم قلعے میں آجائے گا جس کی تسخیر ناممکن ہے۔ سوائے خدا کے اور کسی سے نہ مانگ کہ عطا فرمانا اور محروم رکھنا سب اُسی کے قبضۂ اختیار میں ہے۔ بکثرت استخارہ کیا کر۔

میری وصیت پر خوب غور و فکر کر، اسے پسِ پُشت نہ ڈال کہ صحیح بات وہی ہوتی ہے جس سے فائدہ پہنچے۔ ایسا علم جو آدمی کو کوئی فائدہ نہ پہنچائے کسی کام کا نہیں اور نہ اس کی تحصیل مناسب ہے۔

اے میرے بیٹے!

یہ محسوس کرتے ہوئے کہ میں عمر کی آخری منزل میں پہنچ

گیا ہوں اور جسمانی کمزوری ظاہر ہونے لگی ہے۔ میں نے یہ وصیت لکھنے میں عجلت سے کام لیا کیونکہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قبل اس کے کہ میں وصیت تحریر کروں موت مجھے آلے، یا بدن کی طرح عقل بھی ضعیف ہو جائے یا تو مغلوبِ نفس ہو جائے۔ دنیاوی خواہشات تیرا احاطہ کر لیں اور تُو سرکش گھوڑے کی طرح بے قابو ہو جائے۔

نوجوان لوگوں کے قلب کی کیفیت ہل چلی ہوئی زمین کی سی ہوتی ہے جو ہر قسم کے بیج کو لے لیتی ہے۔ پس یہ وجہ تھی کہ میں نے نہایت عجلت سے یہ وصیت لکھ دی۔ تاکہ قبل اس کے کہ دل سخت ہو جائے اور ذہن کسی اور جانب مائل ہو، تُو ان معاملات سے آگاہ ہو جائے۔

جن تجربات و تحقیق کی بھٹیوں میں سے تیرے پیش رو گزرے اور انہوں نے اس راستے کی دشواریوں اور تلخ کامیوں سے تجھے دوچار نہیں ہونے دیا اور اب وہ چیز تجھے کسی قسم کی تکلیف برداشت کئے بغیر مل رہی ہے جس کی تلاش میں ہمیں سرگرداں ہونا پڑا۔ اور اب وہ چیزیں بھی تیرے روبرو آنے والی ہیں جنہیں خود ہم بھی نہیں دیکھ سکتے۔

اے میرے بیٹے!

میں اتنی طویل عمر پا تو نہیں سکتا جتنی پچھلے لوگوں کی ہوتی تھی لیکن ان کی زندگی کے واقعات پر غور و فکر کرتا رہا ہوں۔ ان کی تلاش میں ان کے پیچھے گیا ہوں اور اب میں انہیں کے زمرے میں شامل ہو گیا ہوں۔

میں نے ان کی زندگی کے واقعات سے اس قدر آگاہی حاصل کی ہے کہ یوں سمجھ لے کہ جیسے میں ان معمّر لوگوں کا ہم عمر ہو گیا ہوں۔ اس طرح اس دنیا کا تلخ و شیریں سیاہ و سپید اور نفع و نقصان مجھ پر آشکارا ہو گیا ہے۔ ان میں سے جو چیز مجھے سب سے بہتر نظر آئی ہے وہ میں نے تیرے لئے پسند کر لی۔ اور اس شے کا تیرے لئے انتخاب کر لیا جو خوبصورت تھی۔ میں نے ہر خراب اور بے فائدہ چیز کو تجھ سے دُور کر دیا۔ میں تجھے ویسا ہی عزیز رکھتا ہوں جیسا ایک شفیق باپ اپنے بیٹے کو عزیز از جان رکھتا ہے۔ اس لئے میں نے یہ وصیت ایسی حالت میں لکھنی پسند کی جب تو خورد سال ہے۔ تازہ وارد بزم آب و گل ہے۔ سلیم الطبع اور پاکیزہ نفس ہے۔

پہلے میرا خیال تھا کہ اس وصیّت نامے میں قرآن حکیم کی تفسیر شرع کے مسائل اور حرام و حلال کی باریکیوں کے متعلق روشنی ڈالوں لیکن مجھے یہ خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں الیسا نہ ہو کہ

اس طرح تُو شبہات میں پڑ جائے گا، جس طرح بعض نفس کے بندے مرضِ تشکیک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

پس اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے یہ وصیت لکھ دی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وصیت تجھ پر گراں گزرے لیکن تجھ پر گراں گزرنا مجھے گوارا ہے۔ مگر یہ گوارا نہیں کہ تجھے تباہی کے راستے پر یک و تنہا چھوڑ جاؤں۔ خدا کی ذات سے مجھے امید ہے کہ وہ اس وصیت نامے کو تیرے لئے باعثِ ہدایت بنائے گا اور تجھے راہِ راست پر گامزن کر دے گا۔

اے میرے بیٹے!

اگر کوئی تیری بات میرے لئے باعثِ مسرت ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ تو خدا سے ڈرے اور خدا تعالیٰ نے جو فرائض تیرے ذمے عائد کئے ہیں انہیں ادا کرنے میں تجھ سے تساہل نہ ہو۔ اپنے آباؤ اجداد اور خاندان کے بزرگوں کا طریق کار اختیار کر کہ آج جس منزل میں تُو ہے کبھی وہ بھی اس منزل سے گزرے تھے اور جس طرح تُو تفکر کرتا ہے وہ بھی کیا کرتے تھے۔ پھر دنیا کے تجربات نے انہیں راہِ راست پر ڈال دیا اور وہ بیکار باتوں سے کنارہ کش ہونے پر مجبور ہو گئے۔

لیکن اگر تُو اپنے اسلاف اور اجداد کے ان تجربات سے

فائدہ اٹھانے پر آمادہ نہ ہو اور خود اس تجرباتی دنیا سے گزرنے کی اُمنگ ہو تو اس کا آغاز کر دے لیکن عقل و خرد کا دامن پکڑ کر، شکوک اور کج بحثی و نادانی کے ساتھ نہیں۔

اس کا آغاز کرنے سے پہلے بارگاہِ الٰہی سے امداد و نصرت طلب کر اور اس کارِ مشکل میں کامیابی حاصل کرنے کی توفیق مانگ۔ شکوک خواہ کسی قسم کے ہوں ان سے بچنے کی کوشش کر۔ کیونکہ شکوک میں مبتلا ہو کر تو راہِ راست سے بھٹک جائے گا۔ جب تک تجھے اس امر کا یقین نہ آجائے کہ تیرا قلب ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہو کر تیرے قابو میں آگیا ہے، تیری عقل میں پختگی اور ٹھہراؤ آگیا ہے اور تیرا ذہنی انتشار دُور ہو گیا ہے اس وقت تک اس منزل میں گامزن نہ ہونا، ورنہ اندیشہ ہے کہ تُو اس راستے کی تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرے۔ یاد رکھ کہ متلاشیانِ حق نہ اندازے لگاتے ہیں اور نہ حیرانی میں گم ہوتے ہیں۔ اس حالت میں مبتلا ہونے سے کہیں اچھا ہے کہ آدمی یہ راستہ اختیار ہی نہ کرے۔

اے میرے بیٹے!

میری وصیت پر اچھی طرح غور کر اور اس حقیقت کا ادراک کر لے کہ جو موت وارد کرتا ہے، وہی زندگی بھی بخشتا ہے، جو

پیدا کرتا ہے وہی مارتا بھی ہے۔ فنا کرنے والا نئی زندگی سے ہمکنار بھی کرتا ہے۔ جو امتحان لینے کے لئے مصائب و آلام میں مبتلا کرتا ہے وہ ان مصیبتوں سے رستگاری بھی عطا فرماتا ہے۔ اپنے قلب کو اس یقین سے معمور کر لے کہ نظامِ کائنات اللہ تعالیٰ کے ایک مقررہ قانون پر قائم ہے۔ جس کے تحت انسان انعامات سے بھی سرفراز کیا جاتا ہے اور اسے آزمائشوں میں بھی ڈالا جاتا ہے۔ اور پھر عقبیٰ میں اسے جزا بھی ملتی ہے۔ جس کی تفصیلات سے ہم بے خبر ہیں۔

اگر کوئی بات تجھے خلافِ عقل معلوم ہو تو جلدی سے اس کا انکار نہ کرنا بلکہ یہ سمجھ کہ تیرے فہم کا قصور ہے اور اس کے بارے میں پھر سوچ۔ کیا تو نہیں جانتا کہ پیدائش کے وقت تو بے علم تھا، تو نے یہ علم رفتہ رفتہ حاصل کیا اور بے شمار باتیں ابھی تک تیرے احاطۂ علم و خبر سے باہر ہیں اور تجھے حیرت میں ڈال دینے والی ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جن میں (اوّل اوّل) تیری نگاہ کام نہیں کر سکتی۔ پھر جب تو مزید غور و فکر کرتا ہے تو ان کی حقیقت تیرے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس ہستی سے اپنا تعلق قائم رکھ جو تیری خالق ہے۔ رازق ہے اور جس نے تیری تخلیق کو درجۂ کمال تک پہنچایا، تو اپنی

عبادت کو اسی کے لئے مخصوص کر دے، اسی کی بارگاہ میں سرِ عبودیت جھکا کر اور اپنے دل کو اس کے خوف سے لرزاں و ترساں رکھ۔

اے میرے بیٹے!

ہستی باری تعالیٰ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آگاہی بخشی ہے ایسی آگاہی اور کسی نے نہیں دی۔ اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رہبر اور نجات دہندہ بنا۔ میں نے تجھے نصیحت کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دی ہے۔ یاد رکھ کہ اپنی فلاح و بہبود کے بارے میں تو جتنا چاہے غور کرے لیکن اتنا غور نہیں کر سکتا جتنا تیرے بارے میں خود میں غور کرتا ہوں۔

اے میرے بیٹے!

اگر تیرے رب کی ربوبیت اور اس کے کاموں میں کوئی اور شریک ہوتا تو اس کی طرف سے بھی رسول بھیجے جاتے اس کی بھی حکومت ہوتی اور اس کی سلطنت کے آثار و اخبار کا نشان ملتا۔ اس کے افعال اور اس کی صفات مشاہدے میں آتیں مگر ایسا نہیں ہے۔

صرف ایک ہی خدا ہے اور خود اس کا بھی اپنے بارے

میں یہی ارشاد ہے۔ اس کی سلطنت و حکومت بغیر کسی شریک کے قائم ہے۔ وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ اوّل بھی وہی ہے اور آخر بھی وہی ہے۔ مگر نہ اس کی ابتدا ہے اور نہ آخر۔ ہمارے قلب و نظر اس کی شانِ ربوبیت کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اس عالی شان کی شان اس سے بہت ارفع ہے۔

اس لئے تو اس کم حیثیت اور بے مقدور شخص کی طرح اعمال بجالا، جو اپنے رب العالمین کی فرماں برداری کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور اس کی سزا کے خوف سے اور اس کے غضب سے کانپتا رہتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے کرم کا بے حد و حساب محتاج سمجھتا ہے۔ اس بات کو نہ بھول کہ تیرے رب نے تجھے نیک باتیں اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اور بدیوں سے رُکنے کا حکم دیا ہے۔

اے میرے بیٹے!

میں نے تیرے سامنے دنیا کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ اس کا احوال بیان کر دیا ہے، اس کے کمزور اور بے فائدہ ہونے کی اطلاع دے دی ہے۔ عقبیٰ کی کیفیت سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔ اور اس کے لذتوں و انعامات سے بھی تجھے مطلع کر دیا ہے۔

اور مثالوں کے ذریعہ تجھ پر حقیقت واضح کر دی ہے۔ تاکہ تُو ان باتوں سے عبرت پکڑے اور ان پر عمل کرے۔ وہ لوگ جنہوں نے دُنیا کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے انہیں اس کو چھوڑنے سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ اس قوم کے مشابہ ہیں جو خشک سالی کے مارے ہوئے علاقہ سے نقلِ مکانی کر کے سرسبز و شاداب وادی کی طرف جا رہی ہے۔

یہ لوگ رات کی صعوبتیں اور عزیزوں کی جدائی اس لئے برداشت کرتے ہیں تاکہ وہ ایک ایسے علاقے میں داخل ہوں۔ جہاں ان کے لئے ہر قسم کا آرام موجود ہے۔ وہ راستے کے مصائب کی پرواہ نہیں کرتے، خرچ کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ وہ اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے جانے کو محبوب رکھتے ہیں۔

لیکن وہ لوگ جو دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں انہیں اس کی جُدائی گوارا نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کے مشابہ ہیں جو زرخیز وادی کو چھوڑ کر چٹیل اور خشک سالی کے مارے ہوئے علاقے کی طرف رواں دواں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایک بڑے سفر پر نکلے ہیں۔ ان کے حق میں یہ سفر بہت تکلیف دِہ ہو گا۔ ان لوگوں کے نزدیک پہلی منزل کی جدائی اور اس نئی منزل میں داخلہ ایک بہت بڑی آفت ہو گی۔

اے میرے بیٹے!

دوسروں کے ساتھ سلوک کرنے کے لئے اپنے اور ان کے درمیان اپنی ذات کو پیمانہ بنا اور جو چیز تو اپنے حق میں پسندیدہ سمجھتا ہے اسے ان کے لئے بھی پسند کر اور جو چیز تجھے اپنے لئے پسند نہیں وہ ان کے لئے بھی پسند نہ کر۔ کسی کے ساتھ ظالمانہ سلوک نہ کر کہ تُو نہیں چاہتا تجھ پر ظلم کیا جائے۔ تُو بھی اسی طرح سب کے ساتھ اچھا سلوک کر، جس طرح تُو چاہتا ہے کہ لوگ تجھ سے حسنِ سلوک کا مظاہرہ کریں۔

تجھے دوسروں کی جو باتیں پسند نہیں آتی ہیں اگر وہی باتیں تجھ سے سرزد ہوں تو تُو انہیں بھی ناپسند کر۔ اگر تیرے ساتھ وہ سلوک کیا جائے جو تُو دوسروں کے ساتھ کرتا ہے تو اس سلوک کو درست جان۔ علم کے بغیر کوئی بات نہ کر.... اور دوسروں کے لئے وہ کلمہ کہنے سے گریز کر کہ اگر تیرے حق میں کہا جائے تو تجھے پسند نہ آئے۔

خود پسندی بے وقوفی ہے اور یہ انسان کے نفس کو ہلاک کر دیتی ہے۔ اس لئے ایسا راستہ اختیار کر جس سے تیرا ایمان سلامت رہے۔ اپنی دولت پر خزانچی بن کر نہ بیٹھ کہ تیرے بعد دوسرے اسے بے دریغ ضائع کر دیں۔ اور جب تجھے

اللہ تعالیٰ سے ہدایت نصیب ہو جائے تو صرف اسی سے ڈرتا رہا کر۔ تجھے ایسے سفر پر جانا ہے جس کی مسافت بڑی طویل ہے۔ اور جس کا راستہ بڑا کٹھن ہے۔ یہ سفر طے کرنے کے لئے حسنِ طلب بڑی چیز ہے۔ خیال رکھ کہ یہ سفر طے کرتے ہوئے تیرا زادِ راہ اتنا زیادہ بھی نہ ہو جائے کہ تیری قوت اسے اٹھا کر چلنے سے جواب دے دے۔

اگر اپنی قوت سے زیادہ بوجھ اٹھائے گا تو یہ تیرے لئے بلائے بے درماں ہو کر رہ جائے گا اِس لئے اگر تجھے ایسے مزدور مل جائیں جو تیری زادِ راہ اٹھانے کے لئے تیار ہوں تو یہ بوجھ ان کی پیٹھ پر رکھ دے تاکہ جب تجھے ضرورت آگھیرے تو اس سے فائدہ اُٹھا سکے۔

اگر کوئی شخص ایسی حالت میں تجھ سے قرض مانگے جب تُو مال دار ہو تو اسے قرض دے دے تاکہ جب تنگدستی کا زمانہ آئے تو وہ تیرے کام آسکے۔ تجھے ایک دشوار گزار منزل سے گزرنا ہے، یہ وہ منزل ہے جس میں بوجھل شخص سے ہلکا پھلکا شخص اور ٹھہر ٹھہر کر قدم اٹھانے والے شخص سے تیز رفتار شخص بہتر ہے۔ تجھے اس منزل سے ضرور گزرنا پڑے گا۔ اس کے بعد دو ہی چیزیں ہیں، جنّت یا دوزخ۔ اس لئے اس منزل پر

پڑاؤ کرنے سے قبل ہی اپنا سامان بھیج دے اور قرار پکڑنے سے پیشتر جائے قرار کو درست کرلے، کیوں کہ قاصدِ اجل آجانے کے بعد نہ عذر تلاش کرنے کا موقع ہوگا اور نہ تُو دنیا میں واپس آ سکے گا۔

یاد رکھ! کہ جس ہستی کے قبضہ میں زمین اور آسمانوں کے خزانے ہیں، اس نے دستِ طلب پھیلانے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔ اور دُعا قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس نے فرمایا ہے کہ مانگنے والوں کو عطا کیا جائے گا اور جو لوگ طالبِ رحم ہیں ان کے ساتھ رحم کا معاملہ کیا جائے گا۔ اس نے اپنے اور تیرے درمیان دربانوں کو روک بنا کر کھڑا نہیں کیا۔ نہ سفارش کرنے والوں کو واسطہ بنایا ہے۔

جب تو اپنی توبہ توڑ دیتا ہے تو پھر بھی وہ تجھے محروم نہیں کرتا ہے اور نہ بدلہ لیتا ہے۔ اور جب تو پھر اس کی طرف جُھکتا ہے تو وہ تجھے طعن و تشنیع کا نشانہ بھی نہیں بناتا اور پردہ فاشی بھی نہیں کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ ایسا کرتا تو اپنے اعمال کی وجہ سے تو اسی قابل تھا۔ وہ بغیر ردّ و کد کے تیری توبہ قبول کر لیتا ہے اور اپنی رحمت سے مایوس نہیں کرتا۔

وہ تو توبہ کرنے کو بھی نیکیوں میں شمار کرتا ہے۔ ایک

بدی اس کے حساب میں ایک ہی رہتی ہے۔ مگر ایک نیکی کو وہ مہربان و مشفق دس گنتا ہے۔ توبہ کا دروازہ اس نے کھول دیا ہے تُو اُسے آواز دیتا ہے تو وہ تیری آواز سُنتا ہے۔ تُو اُسے یاد کرتا ہے اور اس کی حمد و ثناء کرتا ہے تو وہ تیری جانب متوجہ ہوتا ہے، تُو اُس کے سامنے اپنی آرزوئیں بیان کرتا ہے۔ اپنی مصیبتوں کی کہانیاں سُناتا ہے، اس سے فریاد کرتا ہے۔ اُسے مُشکل کُشائی کے لئے پُکارتا ہے۔ اس سے درازیٔ عُمر، صحتِ جسم اور فراخیٔ رزق کی درخواست کرتا ہے اور رحمت کے وہ خزانے مانگتا ہے جن کا دینا سوائے اس کے اور کسی کے اختیار میں نہیں۔

ذرا سوچو تو کہ اس نے یہ فرمایا کر " کہ مانگ جو مانگنا چاہتا ہے"۔ اپنی رحمت کے خزانوں کی کُنجیاں تجھے عنایت کر دیں تاکہ جس وقت دل چاہے تُو دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا کر اس کی رحمتوں کے دروازے کھلوا لے اور رحمتوں کے بادل برسوا لے۔ لیکن ایک بات یاد رکھ کہ اگر کسی وقت قبولیتِ دُعا میں تاخیر ہو جائے تو اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو جانا کہ دُعا اس وقت تک قبول نہیں ہو سکتی جب تک نیّت دُرست نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ قبولیتِ دُعا میں اس لئے

...تاخیر کر دی جاتی ہے کہ مانگنے والے کو زیادہ ثواب دینا مقصود ہوتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مانگنے والے کو (وقتی طور پر) محروم کر دیا جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی اس کے لئے محروم ہی رہنا اچھا ہوتا ہے۔ کیوں کہ بہت سی آرزوئیں ایسی بھی ہیں جو اگر پُوری ہو جائیں تو انسان آخرت میں روسیاہ ہو جائے، اس لئے تُو ان چیزوں کے حصول کے لئے دُعا مانگا کر جو تیرے لئے مفید ہوں۔ اور خدا تعالیٰ اُن چیزوں کو تجھ سے دُور رکھے۔ جو تیرے لئے نقصان کا موجب ہوں۔

یاد رکھ کہ سونا چاندی اتنی بڑی چیز نہیں ہے۔ تُو مال کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے، مال تیرے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ تجھے آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ دنیا کے لئے نہیں۔ تجھے فنا ہو جانے کے لئے بنایا گیا ہے ہمیشہ باقی رکھنے کے لئے نہیں۔

تُو ایک لڑکھڑاتے ہوئے مقام پر کھڑا ہے۔ پس تُو کہیں نہیں جا سکتا۔ آخر کار تجھے لقمۂ اجل بننا پڑے گا۔ اس لئے غافل مت رہ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تُو توبہ کرنے کے ارادے ہی کرتا رہے اور موت آ کر کھڑی ہو جائے۔ اگر

ایسی صُورت پیش آگئی تو سمجھ لے کہ تُو نے خود کو ہلاکت میں ڈال دیا۔

اے میرے بیٹے!

نہ موت کی طرف سے غافل ہو نہ عمل کی طرف سے اور نہ موت کی بعد کی کیفیت کی طرف سے تاکہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بُلاوا آجائے تو تُو پہلے ہی سے اس اچانک بُلاوے کو سُننے کے لئے تیاری کر چکا ہو اور روانگی کا سامان دُرست ہو۔ جو لوگ دُنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں تو اُن کے ساتھ مقابلے کر کے اپنے آپ کو فریب میں مبتلا نہ کر لینا۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی (ناپائیداری کی) حقیقت پر سے پردے اُٹھا دیئے ہیں۔ خود دُنیا بھی اپنے فانی ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔ اور اس نے اپنی آلودگیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ دنیا کے پیچھے پڑے رہنے والے لوگ تو ان کُتّوں اور درندوں کی طرح ہیں جو ایک دوسرے پر بھونکتے ہیں، غرّانے اور پھاڑ کھانے کے لئے دوڑتے ہیں۔

یہاں طاقت ور، کمزوروں کو لقمہ بنا لیتے ہیں اور بڑے چھوٹوں کو کھا جاتے ہیں، اُن میں کچھ اُن اُونٹوں کی مانند ہیں جو پالتو ہونے کی وجہ سے نقصان نہیں کر سکتے اور کچھ اُن اُونٹوں

کی طرح ہیں جو شتر بے مہار ہونے کی وجہ سے ہر طرف مُنہ مارتے پھرتے ہیں۔ ان کی عقلیں جاتی رہی ہیں۔ یہ ایسے راستوں پر چل رہے ہیں جن سے واقف ہی نہیں ہیں۔ یہ ایسی اُونچی وادیوں میں دھکیل دیئے گئے ہیں جو آفتوں سے بھری ہوئی ہیں۔ ان وادیوں میں مصائب و آلام ہی ان کی غذا ہیں۔ ان کا کوئی چرواہا اور محافظ نہیں ہے۔ دنیا کی محبت انہیں اندھیرے راستوں میں پھرا رہی ہے۔ ان کی آنکھیں مینارۂ نُور کو دیکھنے سے معذور ہیں۔ یہ دُنیا کی نیرنگیوں میں پھنسے ہوئے ہیں، اس کی لذّتوں نے انہیں اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ یہ لوگ اسی کو اپنا خدا سمجھتے ہیں۔ دنیا ان کے ساتھ اور یہ دُنیا کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ وائے، بہر حال کہ ان لوگوں نے اس زندگی کو بھلا دیا جو انہیں درپیش آنے والی ہے۔

وہ وقت قریب ہے جب تاریکی کے پردے اُٹھ جائیں گے اور کارواں اپنی منزل سے ہمکنار ہو جائے گا۔ جو شخص زمانے کے گھوڑے پر سوار ہے وہ تو سفر میں ہے خواہ وہ کہیں کھڑا ہو اور وہ بھی مسافر ہے جو آرام سے کسی جگہ قیام کر چکا ہو۔ یاد رکھ کہ تیری ساری خواہشیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ وقتِ مقررہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ تو بھی اسی راستے پر رواں

دواں ہے جس پر تیرے پیش رو گامزن ہو چکے ہیں۔ اس لئے اپنی خواہشات کو حدِ اعتدال میں رکھ۔ کسبِ معاش میں سلامتی کا راستہ اختیار کر، خوب سمجھ لے کہ بعض خواہش انسان کو بے نصیب کر دیتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر طالب کو مل ہی جائے۔ اور ہر وہ شخص جو ہاتھ نہیں پھیلاتا ہے محروم ہی رہے۔ اپنے آپ کو ہر ذلّت سے محفوظ رکھ خواہ وہ تجھے تیری کیسی ہی پسندیدہ چیزوں کی طرف مائل کرے۔

یاد رکھ! عزت ایسی چیز ہے جس کی قیمت لگائی ہی نہیں جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے تیری تخلیق مردِ آزاد کی حیثیت سے کی ہے۔ اس لئے اپنے آپ کو دوسروں کی غلامی پر آمادہ نہ کر جو اچھائی بُرائی کے راستے سے آئے وہ اچھائی نہیں ہو سکتی اور جو دولت ذلت کے راستے سے حاصل ہو وہ دولت نہیں ہو سکتی۔

دیکھو! حرص و ہوس میں مُبتلا ہو کر ہلاکت کے کنارے پر نہ پہنچ جانا۔ کوشش کر کہ تیرے اور تیرے خدا کے درمیان کسی کا احسان روک بن کر نہ کھڑا ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے تیرے مقدر میں جو کچھ لکھ دیا ہے۔ وہ تو بہر حال تجھے مل ہی جائے گا۔ خالق کی طرف سے اگر تھوڑا سا بھی

ملے تو اسے مخلوق کی طرف سے دیئے جانے والے بہت کے مقابلے میں زیادہ سمجھ۔ گو مخلوق کو جو کچھ دیا ہے خالق ہی نے دیا ہے۔

یاد رکھ! خاموشی کی بنا پر آنے والی مصیبت دُور ہو سکتی ہے لیکن تیز زبان کو آزاد چھوڑ دینے سے جو خرابی رُونما ہوتی ہے اس کا مداوا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیا تیرے مشاہدے میں نہیں آیا کہ پانی اس وقت تک نہیں رُکتا جب تک مشک کا مُنہ نہ باندھ دیا جائے۔

دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی اپنا مال احتیاط سے خرچ کرے۔ مانگنے سے جو ندامت ہوتی ہے اس سے تنگ دستی کی مایوسی کہیں اچھی ہے۔ ناجائز ذرائع سے دولت کمانے سے وہ مشقت اچھی ہے جس کے نتیجے میں عزت کے ساتھ دو روٹیاں میسّر آجائیں۔

راز اسی وقت تک راز رہتا ہے جب تک آدمی اسے خود ہی پوشیدہ رکھے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنا راز فاش کر کے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مار لیتا ہے۔ جو شخص زیادہ بولتا ہے اس سے بہت زیادہ غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ نیکوں کی صحبت میں بیٹھا کر تُو بھی نیک ہو جائے گا۔ بُروں کی صحبت

سے اجتناب کرنا بدی سے اجتناب کرنا ہے۔ سب سے بُرا کھانا حرام کھانا ہے سب سے بڑا ظلم وہ ہے جو کمزوروں پر کیا جائے۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیماری دوا اور دوا بیماری بن جاتی ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ خیر خواہ سے بدخواہی کا اور بدخواہ سے خیر خواہی کا فعل سرزد ہوتا ہے۔ غیر یقینی چیزوں پر اعتماد نہ کر کہ یہ مُردوں کے بھروسہ کرنے کی چیزیں ہیں۔ تجربات سے فائدہ اٹھانے کا نام عقل ہے۔ سب سے اچھا تجربہ وہ ہے جس سے سبق حاصل ہو۔ موقع ہمیشہ تیرے موافق نہیں ہوتا۔ اس لئے قبل اس سے کہ یہ تیرے ہاتھ سے جاتا رہے اس سے فائدہ اٹھالے۔

ہر جدوجہد کرنے والے شخص کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کامیاب ہی ہو۔ ہر وہ شخص جو چلا جاتا ہے واپس نہیں آتا۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اپنا مال گنوا دیا جائے اور اپنی عاقبت خراب کر لی جائے۔ ہر شخص کو جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ اس کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ پس تقدیر کا لکھا ہوا ظہور میں آکر رہے گا۔ خواہ جلد ہو یا بدیر۔

تجارت کرنے والا ایک لحاظ سے جُوا کھیلتا ہے۔ بعض دفعہ

ایسا بھی ہوتا ہے کہ قلیل کثیر سے زیادہ بابرکت ثابت ہوتا ہے۔
اس شخص کی امداد جو تجھے رسوا کرنے کے درپے رہتا ہے اور اس
شخص کی دوستی جو تجھ سے بدظنی رکھتا ہے بھلائی سے خالی ہے۔
اُس وقت تک زمانے کا ساتھ دیا جائے جب تک وہ تیرا
ساتھ نہ چھوڑے۔
دیکھ حرص و ہوس تیری بینائی اور دشمنی تیری عقل کو سلب
نہ کرلے۔ اگر تیرا دوست رشتۂ دوستی منقطع کر دے تو تجھے چاہیئے
کہ اسے جوڑ دے وہ جتنا تجھ سے دُور ہو تُو اتنا ہی اس کا
قرب حاصل کر، اگر وہ سختی سے پیش آئے تو تیری طرف سے
نرمی کا مظاہرہ ہو۔ اگر اس سے غلطی سرزد ہو جائے تو تجھے اس
کی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے عذر پیش کرنا چاہیئے۔ اپنے
دوست کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار کر کہ وہ تیرا آقا ہے لیکن
یاد رکھ کہ یہ طرزِ عمل بے موقع نہ ہو۔ نا اہل اس طرزِ عمل کا مستحق
نہیں ہے۔
اپنے دوست کے دشمن کے ساتھ دوستی کی پینگیں نہ بڑھا
اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تیرا دوست بھی تیرا دشمن بن جائے گا۔ اپنے
دوست کو نصیحت کرتے وقت اس بات کی پرواہ نہ کر کہ اسے
اچھی لگے گی یا بُری۔ اسے دو ٹوک رنگ میں نصیحت کیا کر۔

غیض و غضب کے عالم میں برداشت سے کام لیا کر۔ میں نے جس قدر شیریں غصّے کے جام کو پایا اتنا شیریں اور کوئی جام نہیں پایا۔

جو شخص تجھ سے سختی کا برتاؤ کرے تو اس سے نرمی کا سلوک کر۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس میں اپنے آپ نرمی پیدا ہو جائے گی۔ اگر تُو کسی سے دوستی کا رشتہ منقطع کرنے پر مجبور رہی ہو جائے تو بھی تھوڑا سا تعلق ضرور باقی رکھ تاکہ جب چاہے یہ رشتہ دوبارہ قائم کر سکے۔ کسی شخص کے حقوق اس زعم میں پامال نہ کر کہ یہ تیرا دوست ہے۔ جب تُو اس کے حقوق پامال کر دے گا تو وہ تیرا دوست نہیں رہے گا۔

اپنے کُنبے کی طرف سے لاپرواہی نہ برتنا کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرا کُنبہ تیری وجہ سے بد نصیبی کا شکار ہو جائے۔ ایسے شخص کی طرف متوجہ نہ ہونا جو تیری طرف سے بے نیازی کا اظہار کرے۔ تیرا دوست رشتۂ دوستی منقطع کرنے میں اور تُو اس رشتے کو ہموار کرنے میں ہم سطح نہ ہونے پائے۔ تیرا پلّہ ہمیشہ جُھکا ہوا ہونا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ تُو نیکی سے زیادہ بدی میں سرگرمی دکھانے لگے۔

ظالم کے ظلم کی وجہ سے رنجیدہ نہ ہو۔ وہ تجھے نہیں اپنے

آپ کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اگر غور کرے تو تجھے اس ظلم سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔ جس شخص کے ذریعے سے تجھے مسرت حاصل ہو اس کا بدلہ یہ نہیں کہ تو اُس کے دل کو رنجیدہ کرے۔

اے میرے بیٹے!

رزق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جس کی تلاش میں تُو سرگرداں رہتا ہے۔ اور اس کی دوسری قسم وہ ہے جو تیری تلاش میں رہتی ہے۔ اگر تُو اس کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دے تو یہ خود بخود تجھے تلاش کرے گا۔

اس دنیا کے مال و منال میں اپنا حصّہ اتنا ہی سمجھ جس سے تیری عقبیٰ سنور جائے۔ اگر تجھے اس چیز کا غم ہے جو تیرے پاس سے جاتی رہی تو اس شے کا بھی غم کر جو تجھے نہیں مل سکی۔ آنے والے زمانے کو گزرے ہوئے زمانہ سے بہتر سمجھ۔ اپنے آپ کو ان لوگوں کے گروہ میں شامل نہ کر جو نصیحت سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ بلکہ ملامت سے راہِ راست پر آتے ہیں۔ عقلمند کے لئے معمولی نصیحت ہی کافی ہوتی ہے مگر جانور ڈنڈے سے سیدھے ہوتے ہیں۔

ناجائز خواہشات و شبہات اور وسوسوں پر قابو پانے کا طریقہ یہ ہے کہ صبر و یقین کی چٹان پر مضبوطی سے قدم جمالے۔ میانہ روی

کو چھوڑنے والا غلط راستے پر پڑ جاتا ہے۔ حقیقی دوست کو قرابت دار کی جگہ پر سمجھ۔ مخلص دوست وہ ہے جو تیری عدم موجودگی میں بھی خواہی کرے۔

خواہشاتِ نفسانی اور بدقسمتی ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، بہت سے عزیز اور دوست ایسے ہیں جو غیروں سے بھی بدتر ہیں اور بہت سے غیر ایسے ہیں جو عزیزوں اور دوستوں سے کہیں بہتر ہیں۔ بے وطن اسے کہتے ہیں جو سچّے دوست سے محروم ہو۔

حق کے راستے سے روگردانی کرنے والے پر راہ تنگ ہو جاتی ہے۔ حیثیت کے مطابق زندگی گزارنے والے کی آبرو برقرار رہتی ہے۔ محکم ترین رشتہ وہ ہے جو خدا اور بندے کے درمیان ہے۔ جو شخص تجھ سے لاپرواہی برتتا ہے وہ تیرا دوست نہیں ہے۔ جس وقت امید میں موت نظر آنے لگے تو نا اُمیدی ہی زندگی بخش بن جاتی ہے۔

ضروری نہیں کہ ہر عیب ظاہر ہو جائے، ہر موقع سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بینا ٹھوکر کھاتا ہے اور نابینا بغیر ٹھوکر کھائے سیدھا راستہ طے کر لیتا ہے۔ بُرائی کو اپنے آپ سے دُور رکھ۔ کیونکہ یہ تیری خواہش پر بڑی جلدی

واپس آجائے گی۔ نادان سے رشتۂ دوستی منقطع کرنا اور دانا سے دوستی کا رشتہ جوڑنا ایک برابر ہے۔ جو شخص دنیا پر اعتماد کرتا ہے، یہ اس کو دغا دیتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر تیر نشانے پر لگے حاکم وقت کے بدلنے کے ساتھ زمانے میں تبدیلی آجاتی ہے۔ آغازِ سفر سے پہلے رفقائے سفر کو پرکھ لے اور قیام کرنے سے پہلے ہمسایوں کی پڑتال کرلے۔

یاد رکھ! تیری گفتگو سے کسی کی تضحیک کا پہلو نہ نکلتا ہو، خواہ کسی اور کے الفاظ کا اعادہ ہی کیوں نہ ہو۔ عورتوں کے بے پردہ رہنے سے بھی زیادہ یہ بات خطرات کا موجب ہے کہ ان میں بدقماش لوگوں کی آمد و رفت ہو۔ سوائے کسی خاص ضرورت کے انہیں غیروں سے رسم و راہ نہ رکھنے دے۔ عورتوں کو اس امر سے روک کہ وہ تیرے پاس دوسروں کی سفارش لے کر آئیں، ان سے خواہ مخواہ رقابت کا اظہار کر اس طرح نیک نفس عورت کے بھی بدی کی طرف مائل ہونے کا احتمال ہے۔

اپنے ہر خادم کے سپرد کوئی نہ کوئی فرض ضرور کر دے تاکہ وہ تیرے کاموں کو ایک دوسرے پر ڈال کر خراب نہ کریں۔

اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ اکرام کا سلوک کر کہ یہ تیرے بازو ہیں جن کے ذریعہ تو اڑتا ہے۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر

تُو قیام کرتا ہے اور یہ وہ ہاتھ ہیں جو تجھے لڑنے میں کام دیتے ہیں۔ میں تیرا دین اور تیری دُنیا اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہوں اور خدائے بزرگ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ تجھے دینی و دنیوی فلاح عطا کرے۔" والسلام!

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت

اس وصیت کے کچھ عرصہ بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے، آپ کی شہادت کے متعلق مختلف لوگوں نے روایت کی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ معتبر و مستند وہ روایت ہے، جو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے منسوب کی جاتی ہے۔ چنانچہ طبقات میں آتا ہے کہ:

حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ "میں علی الصبح ان (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے پاس گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے گھر والوں کو جگا رہا تھا کہ مجھ پر نیند کا غلبہ ہو گیا۔ حالانکہ اس وقت میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس عالم (خواب) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

مجھے آپ کی اُمّت نے بڑا دُکھ دیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بارگاہِ الٰہی میں دُعا کرو کہ مجھے ان سے بہتر لوگ عطا فرمائے۔ اسی اثناء میں مسجدِ کوفہ کے مؤذن ابن النّباح آئے اور اطلاع دی کہ جماعت تیار ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس طرح کھڑے ہوئے کہ اُن کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور پھر وہ مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے آگے آگے ابن النّباء مؤذن تھے، پیچھے پیچھے میں چل رہا تھا۔

جب دروازے سے برآمد ہوئے تو انہوں نے آواز دی، کہ "لوگو، نماز، نماز"۔ یہ ان کا معمول تھا۔ جب وہ گھر سے نکلتے تو دُرّہ ہاتھ میں ہوتا اور لوگوں کو نماز کے لئے اُٹھاتے جاتے۔ آگے بڑھ کر دو شخص ان کے سامنے آئے اور ان میں سے ایک نے کہا کہ "اے علی (رضی اللہ عنہ) حکم اللہ کا ہے نہ کہ تمہارا۔" یہ کہہ کر دونوں نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) پر حملہ کر دیا۔ ان میں سے ایک شخص کی تلوار جس کا نام شبیب تھا محراب پر پڑی اور دوسرے شخص عبدالرحمٰن بن ملجم کی تلوار آپ کی پیشانی پر پڑی اور کاٹتی ہوئی چلی گئی۔

ابنِ ملجم کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے

سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ اسے اچھی غذا اور نرم بستر دو۔ اگر میں بچ گیا تو اسے معاف کر دوں گا یا قصاص لے لوں گا اور اگر جاں بر نہ ہو سکوں تو اسے بھی میرے پیچھے بھیج دینا۔ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کا اور اپنا معاملہ پیش کر دوں گا۔

اس واقعہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن اور سنیچر کی رات کو زندہ رہے اور اتوار ۱۹ ر رمضان کو وفات پا گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

•

حضرت امام حسن، حضرت امام حسین اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم نے انہیں غسل دیا اور تین کپڑوں میں کفنایا گیا۔ ان کپڑوں میں کرتہ شامل نہیں تھا۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی اور جامع مسجد کوفہ کے قریب اس میدان میں دفن کئے گئے۔ جو الواب کندہ کے متصل واقع ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چار سال نو ماہ خلافت کی اور وفات کے وقت ان کی عمر تریسٹھ (۶۳) سال کی تھی۔

•

بیعتِ حسن رضی اللہ عنہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے قبل آپ بسترِ مرگ پر دراز تھے کہ لوگ آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ آپ کے بعد ہم حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کرلیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ" نہ میں تمہیں اس سے روکتا ہوں اور نہ اس کا حکم دیتا ہوں۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر لوگ حضرت امام حسن (رضی اللہ عنہ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ ہم سے بیعت لے لیجئے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی تجہیز و تکفین سے پہلے ہی ان کی بیعت کرلی گئی۔

بہرحال تجہیز و تکفین سے فراغت کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ مسجد کوفہ میں تشریف لے گئے۔ جہاں ان کی بیعتِ عام کی گئی۔ بیعت کے بعد آپ منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ:۔

"اے لوگو! کل ایسا شخص تمہیں داغِ مفارقت دے گیا جس سے نہ تو لوگ پہلے سبقت لے جاسکے اور نہ آنے والے لوگ اس کے مرتبے کو پہنچ سکیں گے۔ جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم اسے عَلَم دے کر میدانِ جنگ میں روانہ فرماتے تھے تو وہ اُس وقت تک واپس نہ آتا تھا جب تک میدان سر نہ کر لیتا تھا۔ اس کے دائیں طرف جبریل اور بائیں طرف میکائیل ہوتے تھے۔ اُس نے اپنی وفات کے وقت چاندی، سونا کچھ نہیں چھوڑا۔ سوائے ان سات سو درہم (ایک سو پچھتّر روپے) کے جو تقسیم سے بچ رہے تھے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ
اور معاویہ
کشمکش کا پس منظر

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور معاویہ کی کشمکش کا پس منظر

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی بیعتِ خلافت کے بعد اصولاً تنازعہ ختم ہو جانا چاہیئے تھا جو امیر معاویہ کے جارحانہ اقدامات کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ امیر معاویہ کا اختلاف تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تھا۔ اور ان کے بقول حضرت علی رضی اللہ ہی نے قاتلانِ عثمان سے انتقام لینے میں تغافل برتا تھا۔

اب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہو چکے تھے اور ان کی بجائے جس شخص کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی گئی تھی، اس کا اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ خود امیر معاویہ نے بھی کبھی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ پر شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں شریک ہونے کا الزام نہیں لگایا۔

اس لئے ہونا یہی چاہیئے تھا کہ جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لی گئی تھی تو امیر معاویہ بھی اُمّت کے ایک فرد کی حیثیت سے اس خلیفۂ راشد کے حضور سرِ اطاعت خم کر دیتے۔ لیکن اگر وہ اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے تو کم از کم اتنا ہی کرتے کہ اپنے زیرِ تصرف علاقے پر

قناعت کرتے۔ مگر افسوس کہ انہوں نے اچھا نمونہ نہیں دکھایا۔
اور جیسے ہی انہیں خبر ملی کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک جرنیل عبداللہ بن عامر بن کریز کو ایک لشکر دے کر روانہ کیا تاکہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی حدود مملکت پر حملہ کر دیا جائے۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے خلاف امیر معاویہ کی لشکر کشی سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے، کہ امیر موصوف نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جو جنگ لڑی تھی اس میں سو فیصلہ ہوسِ اقتدار کارفرما تھی اور اسی جاہ طلبی اور حرصِ خلافت نے انہیں خلیفۂ راشد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے خلاف برسرِ پیکار ہونے پر اکسایا۔ پیشتر اس کے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ کے درمیان رونما ہونے والی اس کشمکش پر روشنی ڈالی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قبائلِ عرب اور خصوصاً ہاشم اور عبد شمس کی تاریخی کشمکش کا جائزہ لے لیا جائے۔

اس طرح ان اسباب و علل کی نشاندہی ہو جائے گی جنہوں نے اُمّت کو انتشار و افتراق کا شکار بنا دیا اور اس سے ایک نام نہاد مؤرخ کے اس بے معنی دعوے کی بھی قلعی کھل

جائے گی، جس نے اپنی رسوائے زمانہ کتاب میں لکھا ہے کہ عرب میں نسلی کشمکش کے جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں وہ سب محض افسانے ہیں اور خصوصاً بنو ہاشم اور بنو اُمیّہ میں کوئی کشمکش نہ تھی۔

قبائل عرب کی باہمی کشمکش

قدیم عرب کی آبادی مختلف قبائل پر مشتمل تھی۔ ان میں سے بیشتر قبائل بادیہ نشین تھے۔ اور ان کا قیام کسی ایک جگہ مستقل طور پر نہیں رہتا تھا۔ یہ تلاشِ معاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اور دوسری جگہ سے تیسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے۔

ان میں سے جو قبائل اپنی کثرت اور قوت کی بناء پر مضبوط حیثیت کے مالک ہو جاتے تھے، وہ اپنے سے کمزور قبیلوں پر حملہ کر کے انہیں اپنا محکوم بنا لیتے تھے اور اس طرح سے حکومت ان کے قبیلے میں آجاتی تھی۔ حکومت و امارت اپنے ساتھ وسائل عیش و عشرت بھی لاتی ہے۔ اس لئے جب وہ عیش پرست ہو جاتے تو دوسرے قبائل ان پر حملہ کر کے انہیں مغلوب کر لیتے۔ پھر حکمرانی کا نیا دور شروع ہو جاتا

اور شکست خوردہ قبائل یا تو فاتح قبائل کے زیرِ اقتدار رہنا گوارا کر لیتے یا اپنے صحراؤں میں واپس چلے جاتے۔

ان قبائل میں قبیلہ "قضاعہ" بڑا نامور اور اپنے افراد کی کثرت کے لحاظ سے بہت بڑا قبیلہ تھا اور اس نے عرصۂ دراز تک حکومت کی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ شاہانِ رُوم بھی اس کی قوت و شجاعت کے معترف تھے اور انہوں نے خانہ بدوشانِ عرب پر قبیلہ قضاء کا اقتدار تسلیم کر لیا تھا۔ اس قبیلے کی حکومت شام اور حجاز کے درمیانی علاقے میں تھی۔ اور اہلِ حجاز بھی اس کے زیرِ تسلط تھے۔

ان میں تین بڑے نامور بادشاہ گزرے ہیں۔ نعمان بن عمرو۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا عمرو بن نعمان اور اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا نعمان بن عمرو۔ یہ بڑے جاہ وجلال کے بادشاہ تھے اور عرب ان کے سامنے گردنِ اطاعت جُھکائے رکھتے تھے۔ انہیں سارے عرب میں شرافت نسب اور ذاتی عظمت کے لحاظ سے بڑی عزّت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس قبیلے کی متعدد شاخیں تھیں، جن میں کچھ عراق، کچھ شام اور کچھ مکّہ کے قرب وجوار میں آباد تھیں۔

ان میں ایک شاخ کا نام کنعانہ تھا جو مکّہ کے مضافات میں

آباد تھی۔ پھر اس کنانہ کی اور بہت سی شاخیں تھیں۔ جن میں سے سب سے زیادہ مشہور شاخ وہ تھی جسے بعد میں قریش کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اس شاخ کے جدِّ امجد قصی بن کلاب تھے۔ قصی کے والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ فاطمہ بنت سعد نے ربیعہ بن حرام سے شادی کر لی۔ اور ربیعہ، خورد سال قصی اور ان کی والدہ کو لے کر علاقہ شام میں چلے گئے۔ قصی نے شام ہی میں پرورش پائی۔

جب جوان ہوئے تو حج کرنے مکہ گئے اور پھر وہیں رہ پڑے۔ قصی بہت بہادر، سخت مزاج اور بڑے ذہین انسان تھے۔ ان دنوں مکہ پر قبائلِ خزاعہ بنی بکر کی حکومت تھی۔ حُلیل بن حُبشیہ بن سلول مکّہ کا حکمران تھا اور کعبہ کا متولی بھی۔ قصی نے اس کی بیٹی کے لئے اپنا پیغام دیا۔ حُلیل نے قصی کی ذاتی اور خاندانی شرافت، شجاعت اور ذکاوت و ذہانت سے متاثر ہو کر اپنی بیٹی حبیٰ ان کے عقد میں دے دی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حُلیل نے اپنے انتقال سے پہلے وصیّت کی کہ میرے بعد قصی میرا جانشین ہو گا۔ مگر حُلیل کے بیٹے المحترش نے باپ کی وصیت پر عمل نہ کیا اور حُلیل

کے انتقال کے بعد مسندِ اقتدار پر قابض ہو گیا۔

قضاعہ اور بنو بکر کی جنگ

اس اثناء میں مکہ اور اس کے اطراف میں قصی کی شجاعت اور تدبّر و فراست کا سکّہ جم چکا تھا اور لوگ انہیں بڑی عزت و تکریم کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مکہ کے اطراف میں قصی کے ہم قبیلہ کنانہ کے بھی بہت سے لوگ آباد تھے۔

چنانچہ قصی نے ان سے ذکر کیا کہ المحترش نے اپنے باپ کی وصیّت کو پسِ پُشت ڈال کر خود حکومت پر قبضہ کر لیا ہے اور مجھے میرے حق سے محروم کر دیا ہے۔ ایک روایت کے مطابق قصی نے ان سے یہ بھی کہا کہ ہم لوگ ہی حضرت اسماعیل بن حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد ہیں اور ہمیں کو مکّہ پر حکومت کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ ہمارے مقابلے میں بنو بکر اور خزاعہ کو حکومت کا استحقاق کسی طرح نہیں پہنچتا۔ بنو کنانہ نے قصی کی اس رائے سے پورا اتفاق کیا۔

ادھر قصی نے اپنے سوتیلے بھائی رزاح بن ربیعہ کو بھی ایک خط لکھ کر امداد کی درخواست کی چنانچہ رزاح اپنے بہت

سے عزیزوں اور قبیلہ قضاعہ کے لوگوں کے ساتھ قصی کی امداد کیلئے روانہ ہو گیا۔ مکہ پہنچ کر بنو کنانہ اور رزاح کے اہلِ لشکر نے قصی کی قیادت میں بنو بکر اور خزاعہ پر چڑھائی کر دی۔ یکے بعد دیگرے دو بڑی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔

پہلی جنگ میں قصی کو نمایاں کامیابیاں ہوئی۔ دوسری جنگ میں جب بہت خونریزی ہوئی اور لڑائی پھر بھی کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتی تھی تو بعض لوگوں کی کوشش سے ثالثی کی شرط پر جنگ بند ہو گئی۔ فریقین نے یعمر بن عوف بن کعب کو ثالث تسلیم کر لیا۔

یعمر نے فیصلہ کیا کہ:

۱۔ خانہ کعبہ کی تولیت اور مکہ کی حکومت قصی بن کلاب کا حق ہے۔

۲۔ قصی کے ہاتھ سے خزاعہ اور بنو بکر کے جو افراد قتل ہوئے ہیں ان کا خون بہا نہیں لیا جائے گا۔

۳۔ خزاعہ و بنو بکر کے ہاتھ سے قصی کے جو ساتھی قتل ہوئے ہیں ان کا خون بہا خزاعہ و بنو بکر کو دینا ہوگا۔

۴۔ خزاعہ و بنو بکر دونوں خانہ کعبہ اور مکّہ کی حکومت قصی کے حوالہ کر دیں۔

قریش کی حکومت کا آغاز

لیمر کے اس فیصلے نے مکہ ہی کی نہیں بلکہ سارے عرب کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔ بنوبکر و خزاعہ مکہ سے نکال دیئے گئے اور قصی فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہو گئے۔ قصی سے پہلے قریش عرب کے مختلف علاقوں میں منتشر تھے۔ قصی نے انہیں ایک جگہ جمع کیا۔ اس نسبت سے یہ لوگ قریش کہلائے کہ قریش تقرش سے نکلا ہے جس کے معنی اجتماع کے ہیں۔

مکہ پر قبضہ کرنے کے بعد قصی نے شہر کے انتظام اور کعبہ کی نگہبانی کے سلسلے میں ایک دائرہ کار متعین کیا۔ مکہ کی حکومت اور نظم و نسق کے جملہ امور انہوں نے اپنے ہاتھ میں لئے۔ محکمہ مال کا شعبہ بھی انہیں کے پاس تھا۔ مکہ میں رہنے والوں کے علاوہ جو لوگ شہر میں داخل ہونا چاہتے تھے انہیں ایک مقررہ رقم جسے عشر کہتے تھے قصی کو ادا کرنی پڑتی تھی۔ انہیں کو یہ اختیار بھی حاصل تھا کہ جسے چاہیں کعبہ میں جانے دیں اور جسے چاہیں روک دیں۔

حاجیوں کو کھانا کھلانے اور پانی پلانے کا مقدس فریضہ

بھی انہیں کے ذمہ تھا۔ جنگ کے موقع پر علم بلند کرنے کا اختیار بھی انہیں کو حاصل تھا اور مجلسِ شوریٰ کے نگرانِ اعلیٰ بھی وہی تھے۔

قصی نے عرصۂ دراز تک بڑی شان وشوکت سے مکہ پر حکومت کی اور کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ ان کے اقتدار کو چیلنج کرتا۔ پھر جب انہوں نے بڑھاپے کی منزل پر قدم رکھا اور ان کے اعضاء تھک گئے تو انہوں نے اپنے جملہ اختیارات اپنے بیٹے کے سپرد کر دیئے۔ قصی کے چار بیٹے تھے (۱) عبدالدار بن قصی (۲) عبد مناف بن قصی (۳) عبدالعزیٰ بن قصی (۴) عبد بن قصی۔

ان میں سے عبدالدار قصی ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ مگر طبیعت کے لحاظ سے سب سے کمزور واقع ہوا تھا۔ اس کے برعکس عبد مناف بہت مضبوط ارادے کا مالک، بڑا شان و شوکت والا، عقل مند اور فہم وفراست والا شخص تھا۔ اس نے قصی کی زندگی ہی میں بڑی ناموری اور مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ مگر قصی عبدالدار کو زیادہ چاہتے تھے اور انہوں نے اپنے سارے اختیارات عبدالدار ہی کو منتقل کر دیئے تاکہ عبد مناف اس پر غالب نہ آجائے۔ اور اختیارات منتقل کرتے وقت عبدالدار کو مخاطب

کر کے اس سے کہا کہ اے میرے فرزند اگرچہ تیرا بھائی تجھے پر فضیلت رکھتا ہے مگر میں تجھے حکومت کے مندرجہ ذیل اختیارات دے کر تجھے اس کے ہم مرتبہ کئے دیتا ہوں۔

۱۔ جب تک تُو خانہ کعبہ کا دروازہ نہیں کھولے گا ان میں سے کوئی اس میں قدم نہیں رکھ سکے گا۔

۲۔ قریش کا کوئی فرد اعلانِ جنگ نہیں کر سکے گا جب تک کہ تُو علمِ جنگ اپنے ہاتھ سے بلند نہیں کرے گا۔

۳۔ اہلِ مکّہ میں سے کوئی شخص پانی نہیں پیئے گا جب تک کہ تُو نہیں پلائے گا

۴۔ حج کے ایّام میں جو شخص کھانا کھائے گا تیرے ہی دسترخوان پر کھائے گا۔

۵۔ جب تک قریش تیرے گھر میں جمع نہیں ہوں گے، کسی امر کا فیصلہ نہیں کریں گے۔

اس طرح قصی نے اپنے بیٹے عبدالدار کو کعبہ کی نگرانی علمبرداری، حاجیوں کو پانی پلانے اور مجلس شوریٰ کے سارے اختیارات حوالے کر دیئے۔

•

بنو عبد الدار اور بنو عبد مناف میں اختلاف

قصی کے انتقال کے بعد ان کی اولاد میں اقتدار کے لئے رسّہ کشی شروع ہوگئی اور عبد مناف کے سب سے بڑے بیٹے عبد شمس نے تہیہ کر لیا کہ وہ عبد الدار کو اختیارات سے محروم کر کے خود اقتدار پر قابض ہو جائے گا۔ عبد شمس اپنے باپ کی طرح ذہین و فہیم اور صاحب ہمت و شجاعت تھا اور اپنے عہد کی سیاست پر بڑی گہری نظر رکھتا تھا۔ جوڑ توڑ میں اُسے کمال حاصل تھا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے حکومت کرنے کا اہل تھا۔

چنانچہ اس نے بنو تمیم، بنو اسد، بنو حارث اور بنو زہرہ کو اپنے ساتھ ملا کر جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ اِدھر عبد الدار نے بنو عدی، سہیم، بنو مخزوم اور جمح کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا۔ اس کے بعد دونوں فریقوں نے حلف وفاداری اٹھایا۔ عبد شمس اور اس کے حلیف قبائل نے ایک بڑے سے پیالے میں جو خوشبو سے بھرا ہوا تھا اپنے ہاتھ ڈبوئے اور ہر شخص اپنے ہاتھ کعبہ سے مس کرتا جاتا تھا کہ عہد پختہ ہو

جائے۔ اِدھر بنو عبد الدار اور ان کے حلیفوں نے خون سے بھرے ہوئے پیالے میں ہاتھ ڈبو کر وفاداری کا عہد کیا۔

اس کے بعد دونوں فریق میدان میں اُتر پڑے۔ مگر قبل اس سے کہ معرکۂ کارزار گرم ہوتا قریش کے بعض اکابر کی کوششوں سے دونوں مقابل گروہوں میں صلح ہو گئی۔ اور عبد مناف جو اب تک اقتدار سے کلی طور پر محروم تھے، اس صلح کے مطابق انہیں حاجیوں کی میزبانی اور آب رسانی کے اختیارات حاصل ہو گئے، اس طرح وہ بھی اقتدار میں شریک ہو گئے۔

ہاشم کی سرداری

عبد مناف کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ہاشم اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ یہ بڑے خوبصورت، بارعب، شریف النفس اور نہایت فیاض انسان تھے۔ ان کا اصلی نام عمرو تھا۔ ان کی شجاعت اور معاملہ فہمی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی۔ مکّہ کے لوگ ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔

ان کے زمانے میں مکّہ ایک ہولناک قحط کا شکار ہوا اور بڑے بڑے مالدار لوگ ایک ایک دانے کو محتاج ہو گئے۔ عمرو سے لوگوں کی یہ تکلیف دیکھی نہ گئی۔ انہوں نے شام کا

سفر کیا اور وہاں جا کر کثیر تعداد میں روٹیاں پکوائیں، پھر انہیں بوریوں میں بند کر کے اونٹوں پر لدوایا اور مکّہ واپس آ کر اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ انہیں توڑ کر ثرید بنالی جائے۔ جن اونٹوں پر یہ روٹیاں لد کر آئی تھیں انہیں ذبح کرا کر دیگیں چڑھا دیں اور سارے مکّہ میں اعلان کرا دیا کہ جو پیٹ بھر کر کھانا کھانا چاہے وہ عمرو کے دستر خوان پر آجائے۔

چنانچہ مکّہ کے فاقہ زدہ لوگ ٹولیوں میں پیٹ بھر کے کھانا کھاتے۔ چونکہ عمرو نے روٹیاں تڑوا کر ثرید بنوائی تھی، اس لئے ان کا نام ہاشم پڑ گیا۔ یعنی روٹیوں کو تڑوانے والا۔

ہاشم و اُمیہ میں عداوت کا آغاز

جب سے ہاشم نے ثرید بنا کر مکّہ کے قحط زدہ لوگوں کو کھانا کھلایا تھا، اُس وقت سے ان کی قدر و منزلت اور مقبولیت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر ہاشم کے بھتیجے اُمیہ بن عبد شمس کو اپنے چچا کی یہ مقبولیت ایک آنکھ نہ بھائی اور اس کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اپنے خیال میں چچا کو نیچا دکھانے کے لئے اس نے بھی ایک دعوت کا انتظام کرنا چاہا۔ اور کوشش

کی کہ ہاشم سے بڑھ جائے۔ مگر اس میں اُمیّہ کو سخت ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی پر قریش کے بعض لوگوں نے اسے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا۔ اس پر اُمیّہ مشتعل ہوگیا اور ہاشم کی شان میں نازیبا کلمات استعمال کئے۔ معاملہ بڑھ گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اُمیّہ نے ہاشم کو منافرہ کے لئے چیلنج کر دیا۔ منافرہ عرب کی ایک خاص رسم تھی۔ جب دو آدمی ایک دوسرے پر اپنی فضیلت جتلاتے تھے اور دونوں میں سے کوئی کسی کی فضیلت کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا تو کسی غیر جانبدار شخص کو جو قوم میں ممتاز حیثیت کا مالک ہوتا تھا ثالث بنالیا جاتا تھا۔ ایک مقررہ جگہ پر دونوں گروہ جمع ہوجاتے تھے۔ اور ثالث اپنا فیصلہ سُنا دیتا تھا۔

جب اُمیّہ نے ہاشم کو منافرہ کی دعوت دی تو ہاشم نے اپنی عمر اور بلند مرتبے کے پیشِ نظر اس سے منافرہ کرنا پسند نہ کیا۔ مگر قریش نے ہاشم کو مجبور کیا کہ اُمیّہ کی دعوت منظور کرے مجبوراً انہیں منافرہ کے لئے نکلنا پڑا۔ مگر اس کے لئے ہاشم نے یہ شرط مقرر کی کہ ہم دونوں میں سے جس کے خلاف فیصلہ ہوجائے اُسے غالب فریق کو پچاس کالی آنکھ والے اونٹ دینے ہوں گے۔ اور دس سال کے لئے مکہ سے جلا وطن ہونا

پڑے گا۔

اُمیہ کو یہ شرط منظور کرنا پڑی۔ چنانچہ بنی خزاعہ کے ایک کاہن کو ثالث بنایا گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ہاشمؒ اُمیہ پر فضیلت رکھتا ہے اور وہی مکہ کی سرداری کا اہل ہے۔

اس فیصلے کے مطابق اُمیہ نے پچاس اُونٹ ہاشم کو دیئے جنہیں ذبح کر کے ہاشم نے قریش مکہ کی بڑی پُر تکلف دعوت کی۔ اُمیہ اپنے قبیلے کو لے کر مکہ سے شام چلا گیا اور وہاں دس سال تک جلاوطنی کی زندگی گزاری۔

اس طرح ہاشم اور اُمیہ کے قبائل میں عداوت کا آغاز ہوا۔ جس نے بعد میں مستقل صورت اختیار کر لی۔

عبدالمطلب کی سرداری

ہاشم کی وفات کے بعد ان کے بھائی مطلب مکہ کے حاکم ہوئے۔ مطلب کو بھی مکہ میں عزت اور فضیلت حاصل تھی۔ سخاوت میں وہ اپنے پیش رو کے صحیح جانشین تھے اور ان کی یہ خصوصیت اتنی نمایاں تھی کہ قریش نے انہیں الفیض کا خطاب دیا تھا۔

مطلب کی وفات کے بعد عبدالمطلب کو مکّہ کی سرداری ملی۔ یہ ہاشم کے بیٹے تھے مگر چونکہ عبدالمطلب نے ان کی پرورش کی تھی اور اپنے بیٹوں کی طرح انہیں چاہتے تھے۔ اس لئے عبدالمطلب کے نام سے مشہور ہو گئے۔

عبدالمطلب بڑی شان و شوکت کے سردار تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ چاہِ زم زم کی دوبارہ دریافت ہے۔ وہ پاک چشمہ جو اللہ تعالیٰ نے مکّہ کی وادیٔ بے آب و گیاہ میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل (علیہم السلام) کے لئے جاری فرمایا تھا، ریت اور پتھروں کے نیچے دب گیا تھا اور کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کس جگہ واقع ہے۔

عبدالمطلب کے دل میں اس تاریخی اور مقدس چشمے کو دریافت کرنے کی شدید تڑپ تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خواب میں اس چشمے کی جگہ بتا دی۔ اور حکم دیا کہ کدال لے جا کر اس جگہ کو کھودو۔

چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے حارث کو اپنے ساتھ لیا اور کدال لے کر اس جگہ پہنچ گئے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے خواب میں اشارہ فرمایا تھا۔ تین دن تک کھودنے کے بعد چشمہ نکل آیا۔ یہ دیکھ کر عبدالمطلب نے زور سے "اللہ اکبر"

کا نعرہ لگایا اور کہا۔

"یہی وہ چشمہ ہے جو حضرت اسماعیل (علیہ السلام)

کے لئے جاری کیا گیا تھا۔" (طبقات ابن سعد حصہ اول صہ ۴۹)

اس عظیم الشان کارنامے سے عبد المطلب کی عزت و عظمت کا شہرہ مکّہ سے نکل کر سارے عرب میں پھیل گیا اور انہیں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو گئی۔

عبد المطلب اور حرب میں عداوت

جس طرح عبد المطلب کے والد ہاشم کے ایک کارنامے نے اُمیّہ کے دل میں ہاشم کے خلاف حسد کا بیج بو دیا تھا۔ اسی طرح ہاشم کے بیٹے عبد المطلب کے اس کارنامے نے اُمیّہ کے بیٹے حرب کو عبد المطلب کا دشمن بنا دیا۔

چنانچہ ایک بار عبد المطلب اور حرب کے درمیان حبشہ کا سفر کرتے ہوئے کسی معاملے کے متعلق سخت کلامی ہو گئی اور حرب نے عبد المطلب کو منافرے کی دعوت دے دی۔ حبش میں پہنچ کر دونوں نے شاہِ حبشہ نجاشی سے درخواست کی کہ آپ ثالث بن کر فیصلہ کر دیجئے کہ ہم دونوں میں سے کون عظمت کا حامل ہے۔ نجاشی نے اس معاملے میں پڑنا مناسب

نہ سمجھا اور کہا کہ آپ دونوں کسی اور شخص کو ثالث بنالیں۔

آخر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دادا نفیل بن عبدالعزی بن ریاح کو حکم بنایا گیا۔ انہوں نے فیصلہ دیا کہ عبدالمطلب، حرب کے مقابلے میں زیادہ بلند قامت، خوبصورت کثیرالاولاد، خوف و دہشت کے وقت ثابت قدم رہنے والا بہت فیاض اور فصیح البیان ہے۔

چونکہ فیصلہ حرب کے خلاف ہوا تھا۔ اس لئے اس نے نفیل کو بہت سخت سُست کہا اور اس کے خلاف مذاق اُڑانے والے اشعار کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

ابوسفیان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت

حرب کے بعد اس کا بیٹا ابوسفیان اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ ابوسفیان میں قبائلی طرف داری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوائے نبوّت فرمایا اور ابوسفیان نے دیکھا کہ لوگ جوق در جوق آپ کی دعوت پر لبیک کہہ رہے ہیں تو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عروج کو بھی قبائلی حسد کی عینک سے دیکھا اور خیال کیا کہ اگر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کامیاب ہوگئی تو اقتدار بنو ہاشم کے قبضہ میں چلا جائے گا اور بنو اُمّیہ اُن کے محکوم ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس نے قریش مکّہ کے سرداروں سے مل کر حضور کی دعوت کو ناکام بنانے کا تہیّہ کر لیا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مصائب و آلام پیش آئے اُن میں ابوجہل کے بعد ابوسفیان کا حصّہ سب سے زیادہ تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جنگِ بدر کے سوائے فتح مکّہ تک قریش نے مسلمانوں پر جتنے حملے کئے ان سب کی قیادت ابوسفیان نے کی اور مسلمانوں کو تباہ و برباد اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانے میں اس نے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینے میں صرف ابو سفیان ہی شریک نہیں تھا بلکہ اس کی قیادت میں اس کا سارا قبیلہ (بنی اُمّیہ) نسلی عصبیّت کی بنا پر حضور کے درپے آزار تھا۔

چنانچہ اس قبیلے کا ایک بدبخت فرد عقبہ بن ابی معیط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذارسانی میں پیش پیش رہتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ

میں نماز ادا کر رہے تھے۔ استنے میں ابی معیط ایک چادر لے کر آیا اور اسے بل دے کر رسّی کی طرح بٹ لیا اور جوں ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سجدے میں جانے لگے اس بد بخت نے وہ چادر آپ کے گلے میں ڈال کر اس طرح پیچ دیئے کہ آپ کا گلا گھٹنے لگا اور آنکھیں باہر نکلنے لگیں۔ اتفاقاً حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی خانہ کعبہ میں آ نکلے اور انہوں نے یہ کیفیت دیکھ کر حضور کو ابنِ ابی معیط کی زیادتی سے بچایا۔

اس قسم کی ذلیل حرکات سے بنو اُمّیہ اور ان کے حلیف قبائل کا مُدّعا یہ تھا کہ ان سختیوں کی تاب نہ لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فریضۂ تبلیغ سے دست بردار ہو جائیں۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی کوششیں رائیگاں جا رہی ہیں اور وہ حضور کی دعوت کو ناکام بنانے کی جس شدت سے کوشش کر رہے ہیں یہ دعوت اسی شدت اور تیزی سے کامیاب ہو رہی ہے، تو انہوں نے ایک اجتماع منعقد کیا اور بڑی بحث و تمحیص کے بعد ایک قرارداد منظور کی جس کا مضمون یہ تھا۔

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کو جس طرح ممکن ہو پریشان کیا جائے، اس کی ہر بات کا مذاق اڑایا جائے۔ اسے طرح طرح سے ایذا دی جائے جو لوگ محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کے دعوے پر ایمان لے آئے ہیں، ان پر بے دریغ مظالم توڑے جائیں"۔

اس اجتماع میں مکہ کے پچیس سرداروں نے شرکت کی، جن میں ابولہب، ولید بن مغیرہ، ابوجہل اور ابوسفیان بھی شامل تھے۔ اس قرارداد پر بڑی سختی سے عمل کیا گیا مگر نتیجہ پھر بھی سوائے اس کے اور کچھ نہ نکلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہوتا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بڑھتی ہوئی کامیابی سے قریش مکہ بُری طرح گھبرا گئے اور مجبور ہو کر انہوں نے ایذا رسانی کی بجائے ترغیب و لالچ اور افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کیا۔ چنانچہ ایک دن قریش کے اکابر شام کے بعد خانہ کعبہ میں جمع ہوئے اور ایک شخص کو حضور کی خدمت میں یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اکابرِ قوم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے کہ شاید اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نیکی کا جذبہ پیدا کر دیا ہو فوراً خانہ کعبہ میں تشریف لے گئے لیکن وہاں معاملہ برعکس تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی اکابرِ قریش یک زبان ہو کر بولے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کی قسم ہم نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جس

کی وجہ سے قوم پر اتنی مصیبتیں نازل ہوئی ہوں جتنی تمہاری وجہ سے نازل ہوئی ہیں، تم ہمارے آباؤ اجداد کی مذمت کرتے ہو، ہمارے بُتوں کی بے حرمتی کرتے ہو، تم نے ہماری جماعت میں تفریق پیدا کر دی ہے، غرض کوئی مُصیبت ایسی نہیں ہے جو تمہاری وجہ سے ہم پر نہ آئی ہو۔ اگر تم مال وزر کے لالچی ہو تو ہم تمہیں اتنا مال دیئے دیتے ہیں کہ تم مکّہ کے امیر ترین شخص بن جاؤ گے۔ اگر تمہیں سرداری کی خواہش ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار بنانے کو تیار ہیں۔ اگر تم بادشاہی کی تمنا رکھتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بھی تسلیم کر لیں گے۔ اگر تم پر کسی جن یا آسیب وغیرہ کا سایہ ہے تو ہم تمہارا علاج کرانے کے لئے بھی تیار ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اکابرِ قریش کی یہ ساری باتیں بڑے تحمل و بردباری سے سُنیں اور جب وہ اپنی گفتگو ختم کر چکے تو آپ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم نے جتنی باتیں کہی ہیں ان میں سے ایک بھی درست نہیں ہے، نہ تو مجھے مال و دولت کی تمنا ہے نہ کسی اعزاز کا طالب ہوں اور نہ میں بادشاہ بننا چاہتا ہوں، مجھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنا نبی بنا کر مبعوث کیا ہے، مجھ پر اپنی کتاب اُتاری ہے اور مجھے تمہارے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ

کے احکام تم تک پہنچادیتے ہیں۔ اگر تم پیغام الٰہی کو قبول کرلوگے تو یہ امر دنیا اور عقبیٰ دونوں میں تمہارے لئے باعث فلاح ہوگا اور اگر تم نے پیغام الٰہی کو قبول نہ کیا تو میں اس وقت تک صبر سے کام لوں گا جب تک اللہ تعالیٰ تمہارے اور میرے درمیان کوئی فیصلہ نہ فرمادے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دلنشیں تقریر سن کر اکابر قریش نے ہاں یا نہیں میں جواب دینے کے بجائے اپنی تقریر کا رخ دوسری جانب موڑ دیا اور آپ سے طنزیہ انداز میں کہا کہ۔

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تمہیں ہماری باتیں منظور نہیں تو پھر یوں کرو، تمہیں معلوم ہے کہ اس شہر سے زیادہ تنگ اور کوئی شہر نہیں ہے اور نہ کسی شہر میں پانی کی اتنی کمی ہوگی اور نہ کسی شہر کے لوگ اس قدر تنگی ترشی سے گذر بسر کرتے ہوں گے۔ جس تنگدستی سے ہم گذر اوقات کرتے ہیں۔ اس لئے جس خدا نے تمہیں نبی بنا کر ہمارے پاس بھیجا ہے تم اس سے کہو کہ وہ ان پہاڑوں کو یہاں سے ہٹا کر دور لے جائے تاکہ ہماری زمین فراخ ہو جائے۔ تم اپنے خدا سے کہو کہ وہ شام اور عراق کی طرح ہمارے شہر میں بھی چشمے جاری کر دے۔ ہمارے آباؤ اجداد کو بھی دوبارہ زندہ کر دے تاکہ وہ تمہارے دعویٰ کی تصدیق کر

دیں اور اپنے خدا سے کہہ کر قصی بن کلاب کو بھی دوبارہ زندہ کرا دو، کہ وہ بڑا سچ بولنے والا تھا۔ اس کی شہادت سے دعوے کا برحق ہونے یا باطل ہونے کی گواہی ہمیں مل جائے گی اور ہم تسلیم کر لیں گے کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے ہو۔

سردارانِ قریش کی یہ تقریر سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے نہایت متانت و سنجیدگی سے فرمایا کہ جن امور کا تم مجھ سے مطالبہ کر رہے ہو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کے لئے مجھے مبعوث نہیں کیا ہے، اس نے مجھے اس امر کے لئے بھیجا ہے کہ جس کی میں انجام دہی کر رہا ہوں۔ میں نے تمہیں اس کا پیغام سُنا دیا ہے۔ اگر تم اسے تسلیم کر لو گے تو دنیا و آخرت دونوں میں فلاح پاؤ گے۔ اور اگر تم انکار کرو گے تو میں اس وقت تک صبر سے کام لوں گا جب تک میرے اور تمہارے درمیان خدائی فیصلہ ظاہر نہ ہو جائے۔

اس پر قریش بولے کہ اچھا یہ تو وہ امور تھے جو ہم سب اپنے واسطے چاہتے تھے اگر تم یہ نہیں پسند کرتے تو پھر وہ کام کر دو جو تمہارے لئے ہوں یعنی تم اپنے خدا کے حضور دُعا کرو کہ وہ تمہارے ساتھ ایک فرشتہ مقرر کر دے جو تمہاری تصدیق کرے، اور اپنے خدا سے یہ بھی کہو کہ وہ تمہارے لئے

خزانے عطا کر دے تاکہ تمہیں کسبِ معاش کے لئے بازاروں میں پھرنا نہ پڑے اور نہ وہ محنت کرنی پڑے جو اب کرتے ہو۔ اگر یہ سارے امور ظہور میں آ گئے تو ہم یقین کر لیں گے کہ واقعی تم خدا کے نبی اور احترام کے لائق ہو۔

قریش کی اس تقریر کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے اس قسم کی دُعائیں نہیں مانگتا اور نہ ان امور کے لئے مجھے مبعوث کیا گیا ہے۔ مجھے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اگر تم میری تصدیق کرو گے تو یہ امر تمہارے لئے باعثِ خیر ہو گا، بصورتِ دیگر میں انتظار کروں گا کہ وہ ہم دونوں کے متعلق کیا فیصلہ کرتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب سُن کر قریش نے تیسرا مطالبہ کیا کہ اچھا ایسا کرو کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ اگر خدا چاہے تو آسمان کا ٹکڑا گرا دے، تم اس سے کہو کہ وہ آسمان کا ٹکڑا ہم پر گرا دے۔ جب تک ایسا نہیں ہو گا ہم ہرگز قبول نہیں کریں گے۔

اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے قبضہ و اختیار میں سب کچھ ہے۔ اگر وہ چاہے تو ایسا بھی کر سکتا ہے۔ اس پر قریش نے چوتھا اعتراض یہ

کہا کہ "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا تمہارے خدا کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ ہم لوگوں کی طرف سے اس قسم کے سوالات کئے جائیں گے۔ پس اس نے تم کو ان باتوں کے متعلق وقت سے پہلے کیوں نہیں بتا دیا؟

اس لئے اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اب تو ہم کبھی تمہاری تصدیق نہیں کریں گے۔ ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ یمامہ نامی شہر میں ایک شخص رہتا ہے جس کا نام رحمٰن ہے وہی تمہیں یہ باتیں سکھاتا ہے۔ اور خدا کی قسم ہم اس رحمٰن نامی شخص کو تسلیم نہیں کریں گے۔

اس کے بعد اکابرِ قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم پر اتمامِ حُجّت کر دی ہے، اب ہم اس وقت تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے جب تک تمہیں قتل نہ کر دیں یا تمہارے ہاتھ سے ہم خود قتل نہ ہو جائیں۔

جب قریش اس پستی میں اُتر آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کھڑے ہوئے اور گھر واپس تشریف لے آئے۔ اُن سرداران قریش میں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کج بحثی کی اور آخر میں قتل کی دھمکی بھی دی۔ ولید بن مغیرہ

ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ، ابوالبختری بن ہشام وغیرہم کے علاوہ بنو امیہ کا سرخیل ابوسفیان بن حرب بھی تھا۔

جب سردارانِ قریش کی یہ دھمکیاں بھی بے سود ثابت ہوئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں اور زیادہ شدت اختیار کرلی تو قریش مکہ نے ایک اور مشاورت طلب کی اور دارالندوہ میں جمع ہوکر فیصلہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کردیا جائے۔ اس مشاورت میں بھی عتبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، ابوجہل بن ہشام اور ابوسفیان بن حرب پیش پیش تھے۔ اور پھر جب ہر قبیلے کے چیدہ چیدہ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا محاصرہ کرلیا تاکہ آپ کو شہید کردیں تو ان محاصرہ کرنے والوں میں ابوسفیان بن حرب بھی شامل تھا۔

ہجرت نبوی کے بعد جب قریشِ مکہ نے پہلی بار مسلمانوں پر چڑھائی کی اور جنگِ بدر برپا ہوئی تو ابوسفیان اس میں شریک نہیں ہوسکا۔ کیونکہ یہ اس وقت مالِ تجارت لے کر شام گیا ہوا تھا۔ واپسی پر جب اُسے معلوم ہوا کہ قریشِ مکہ کا لشکر بدر کے میدان میں خیمہ زن ہے اور دونوں طرف سے جنگ کی تیاریاں ہورہی ہیں تو وہ بدر کے میدان سے بچتا ہوا اپنے قافلے کے

ہمراہ مکّہ پہنچ گیا۔ مکہ پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ جنگِ بدر میں قریش نے بڑی عبرتناک شکست کھائی ہے اور ان کے تمام نامور سردار قتل ہو گئے ہیں تو اسے اس واقعہ کا سخت صدمہ ہوا۔ اور اس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دشمنی کے شعلے اور زیادہ بھڑک اُٹھے۔

تاریخ میں آتا ہے کہ اس نے قسم کھائی کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدر کی شکست کا بدلہ نہ لے لوں، اس وقت تک نہ سر میں تیل ڈالوں گا اور نہ اپنی بیوی کے قریب جاؤں گا۔ چنانچہ چند روز کے بعد اس نے دو سو افراد کی جمعیت کے ساتھ مدینہ کی طرف کوچ کیا۔ شہر کے قریب پہنچ کر ایک پہاڑی کے دامن میں خیمہ لگایا اور حملہ کرنے سے پہلے خفیہ طور پر اپنے ایک دوست سلام بن مشکم کے گھر جا کر مدینہ کے حالات معلوم کئے۔

پھر واپس آکر اپنی جمعیت کے بعض افراد کو ساتھ لیا اور مدینہ کے ایک مقام عریض پر حملہ کر کے کھیتوں اور کھجوروں کے باغ کو آگ لگا دی۔ ان کھیتوں اور باغ کے مالک ایک انصاری مسلمان تھے۔

ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے اس انصاری اور اس

کے ایک ساتھی کو اس حالت میں کہ وہ سو رہے تھے شہید کر دیا۔ اس واقعہ کی خبر فوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہو گئی۔ چنانچہ آپ مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ موقع پر پہنچے مگر ابوسفیان بھاگ نکلا اور راستے میں ستو کی بوریاں جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا گراتا گیا تاکہ بوجھ ہلکا ہو جائے اور بھاگنے میں آسانی ہو۔

ابُوسفیان اور جنگِ اُحد

جنگِ بدر میں قریش کی شکست کا داغ ایسا نہ تھا کہ مسلمانوں کے چند کھیتوں اور باغوں یا ایک دو انصاری مُسلمانوں کو بے خبری میں شہید کر دینے سے مِٹ جاتا۔ سارے مکہ میں قیامت برپا تھی اور جن لوگوں کے عزیز و اقارب ہلاک ہوئے تھے وہ انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ اس جنگ میں قریش کے جو لوگ گرفتار کئے گئے تھے ان میں ابوسفیان کا بیٹا عمر بھی تھا۔ ابوسفیان کو اپنی اس ذلّت کا بھی احساس تھا اور اسے یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ اگر مسلمانوں کو پوری قُوّت سے شکست نہ دی گئی تو ایک دن وہ سارے عرب پر چھا جائیں گے۔ اور بنو امیّہ کا فخر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔

چنانچہ اس نے قریش کے اکابر کے ساتھ مل کر فیصلہ کیا

کہ مسلمانوں کے ساتھ ایک فیصلہ کُن جنگ کی جائے۔ اور شام سے جو سامانِ تجارت آیا ہے اور اس سفر میں جو منافع ہوا ہے وہ سب مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریوں میں صرف کر دیا جائے۔

چنانچہ زبردست تیاریاں کی گئیں اور ابوسفیان نے عکرمہ بن ابوجہل اور صفوان بن امیہ وغیرہم کے مشورے سے قریش کے علاوہ اہلِ تہامہ اور بنی کنانہ وغیرہ قبائل کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور پانچ ہزار جانثاروں کا لشکر جس میں سات سو زِرہ پوش تھے مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لئے مکہ سے روانہ ہو گیا۔ اس لشکر میں قریش کی مستورات بھی شامل تھیں جو اپنے مردوں کو جنگ میں ابھارنے والے اشعار پڑھ رہی تھیں۔

ابوسفیان کی بیوی ہندہ ان عورتوں کی قیادت کر رہی تھی اور خود بھی جوشیلے اشعار پڑھ کر اہلِ لشکر کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف آگ لگا رہی تھی۔

مدینہ کے قریب پہنچ کر ابوسفیان نے اہلِ لشکر کے سامنے ایک تقریر کی اور اپنے علمبرداروں کو غیرت دلاتے ہوئے کہا کہ:۔

"اے بنو عبدالدار! جنگِ بدر میں تم نے ہمارے

جھنڈے کو گرا کے ہم پہ مصائب و آلام کے پہاڑ توڑ دیئے۔ خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ فتح اور شکست کا انحصار جھنڈے پر ہوتا ہے جب تک یہ کھڑا رہتا ہے لشکر ثابت قدمی کے ساتھ جنگ کرتا رہتا ہے۔ لیکن جب علم گر جاتا ہے تو لشکر کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ اس لئے اگر تم ثابت قدمی اور استقلال کا مظاہرہ کر سکو، پھر تو جھنڈا اُٹھاؤ ورنہ یہ ہمیں دے دو۔"

•

ابوسفیان کی یہ تقریر سُن کر بنو عبدالدار نے یک زبان ہو کر کہا کہ جب دونوں لشکر برسرِ پیکار ہوں گے، اس وقت تم دیکھو گے کہ ہم کس طرح جھنڈے کو سربلند رکھتے ہیں۔

اُحد کے مقام پر پہنچ کر قریش مکہ کا مسلمانوں سے زبردست مقابلہ ہوا اور اس مقابلے میں مسلمانوں کے ہاتھوں قریش کو بُری طرح شکست ہوئی۔ ان کے مشہور علمبرداروں میں سے آٹھ تو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شمشیر خارا شگاف سے ہلاک ہوئے۔ یہ بازی مسلمان جیت چکے تھے،

مگر ان کے ایک کمانڈر کی سیاسی غلطی سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔

ان شہداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ جس مقام پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نعش پڑی ہوئی تھی، اس کے قریب سے اتفاقاً ابوسفیان کا گزر ہوا۔ اس شقی القلب نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے جبڑے میں اپنا نیزہ چبھویا اور کہنے لگا کہ تو نے مزہ دیکھ لیا۔

اس کے بعد ابوسفیان ایک پہاڑی پر چڑھ گیا اور پھر مسلمانوں کو بلند آواز سے مخاطب کر کے بولا کہ اے مسلمانو! ہمارے اور تمہارے درمیان جو لڑائی ہے وہ کنوئیں کے ڈول کی مانند ہے کہ کبھی تمہارے پاس ہے اور کبھی ہمارے پاس ہے۔ یہ لڑائی جنگِ بدر کا بدلہ ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے قبیلے کے مخصوص بُت کو پُکار کر کہا کہ اے ہُبل! اپنے دین کو غلبہ عطا کر۔

ابوسفیان کے یہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سُن لئے۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہدایت فرمائی کہ تم اس کے جواب میں کہو کہ "خدائے ذوالجلال غالب ہے، ہُبل

نہیں)، ہم دونوں کے مقتول ہم مرتبہ نہیں ہو سکتے۔ تمہارے مقتول دوزخ کا ایندھن بنیں گے اور ہمارے شہدا جنتی ہیں"۔

اس کے بعد ابوسفیان نے مسلمانوں کو بآوازِ بلند مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اب ہم تمہارے ساتھ، آئندہ سال پھر قوت آزمائی کریں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو ہدایت فرمائی کہ اس سے کہہ دو کہ اچھی بات ہے یہ ہم دونوں کے درمیان ایک پکّا عہد ہے۔

ابوسفیان کی ناپاک کوشش

اس جنگ میں عارضی طور پر مسلمانوں کی فوج میں ابتری پیدا ہوگئی مگر جلد ہی وہ سب واپس آگئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چاروں طرف سے اپنے حفاظتی حصار میں لے لیا۔ مسلمانوں کی جمعیت کو اکٹھا ہوتا دیکھ کر ابوسفیان اپنے لشکر کو لے کر میدانِ جنگ سے نکل گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال سے کہ قریش مکّہ یہ نہ سمجھیں کہ مسلمان ہمارا مقابلہ کرنے سے عاجز آگئے ہیں۔ مسلمانوں کو دشمن کا تعاقب کرنے کا حکم دیا اور آپ نے خود

اس تعاقب کی قیادت فرمائی۔ مدینہ سے آٹھ میل دُور حمراُ الاسد تک آپ نے ابوسفیان کے لشکر کا پیچھا کیا اور یہاں پہنچ کر تین روز تک قیام فرمایا۔

ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم حمراء الاسد میں مقیم تھے اور ادھر ابوسفیان چند میل آگے ایک مقام روحاء میں اپنے لشکر کے ساتھ خیمہ زن تھا۔ اسی اثناء میں معبد بن خزاعی نامی ایک شخص مدینہ سے مکّہ جاتے ہوئے جب روحاء کے مقام پر پہنچا تو یہاں اس کی ابوسفیان سے ملاقات ہوئی۔ ابوسفیان نے معبد سے کہا کہ ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سرگروہ ساتھیوں کو قتل کر دیا ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ اس پر دوبارہ حملہ کر کے اس کا اور اس کے مٹھی بھر ساتھیوں کا بھی قصہ ختم کر دوں۔

ابوسفیان کی یہ گفتگو سُن کر معبد خزاعی نے کہا کہ محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو خود تمہارا تعاقب کرنے کے لئے مدینہ سے نکلے ہیں اور ان کے ساتھ ایسا زبردست لشکر ہے کہ اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اس لشکر میں بہت سے ایسے مسلمان بھی ہیں جو جنگِ اُحد میں شریک نہ تھے اور اب وہ سخت غضبناک ہو رہے ہیں۔

ابوسفیان بولا تم کیسی باتیں کر رہے ہو میں تو ارادہ کر رہا

ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں پر ایک اور حملہ کر کے ان کا خاتمہ کر دوں۔ معبد نے کہا کہ اگر تم نے مسلمانوں پر چڑھائی کی تو یاد رکھو تم اور تمہارا لشکر سب کے سب ہلاک ہو جاؤ گے۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو جتنی جلدی ہو سکے مکہ واپس چلے جاؤ۔

اس طرح مکہ کے ایک اور سردار صفوان بن امیہ نے بھی اسے جنگ کرنے سے باز رہنے کا مشورہ دیا، اس طرح ابوسفیان اپنی اس ناپاک کوشش میں کامیاب ہوئے بغیر مکہ کو واپس چلا گیا۔

ابوسفیان اور غزوۂ خندق

۵ھ میں یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معرکہ آرائی کرنے کا ارادہ کیا۔ اس مقصد کے لئے وہ مکہ پہنچے اور دیگر قبائل کے علاوہ قریش سے بھی ملے۔ ان کا سردار ابوسفیان فوراً یہودیوں کا ساتھ دینے کیلئے امادہ ہو گیا۔ اور دس ہزار جنگ آزماؤں کا لشکر لے کر یہودیوں کی امداد کے لئے مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس جنگ میں یہودیوں اور قریشِ مکہ کا مقابلہ کرنے

کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے گرد ایک وسیع اور گہری خندق کھدوادی تھی۔ اس لئے محاصرہ نے بہت طول کھینچا۔ اس دوران میں دشمن نے کئی بار مسلمانوں پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر ہر حملہ میں انہیں ناکامی ہوئی۔

آخر اس طویل محاصرے اور ان پے در پے شکستوں سے تنگ آکر ابوسفیان اور قبیلہ غطفان کے سرداروں نے یہودیوں کے پاس پیغام بھیجا کہ ہمیں کل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حملہ کر دینا چاہیئے کیوں کہ ہم لوگ یہاں پڑے پڑے تنگ آگئے ہیں۔ ابوسفیان کے اس پیغام کے جواب میں یہودیوں نے اسے کہلا بھیجا کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اسی صورت میں جنگ کر سکتے ہیں جب تم اپنے کچھ آدمی یرغمال کے طور پر ہمارے ساتھ کر دو۔ کیوں کہ ہمیں ڈر ہے کہ تمہارے جانے کے بعد محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں قتل کر ڈالیں گے۔ لیکن جب تمہارے کچھ افراد ہمارے پاس ہوں گے اور تمہیں معلوم ہو گا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہودیوں پر حملہ کیا ہے تو تم اپنے آدمیوں کو بچانے کے لئے اپنی جمعیت کے ساتھ آجاؤ گے۔

ابوسفیان نے یہودیوں کی یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا اس طرح دونوں میں نفاق پیدا ہو گیا۔ ادھر اس قدر شدت کی آندھی

آئی کہ دشمن کے کھانے کے برتن اُڑ گئے، خیمے اُکھڑ گئے اور سردی کی ایسی سخت لہر آئی کہ دشمن کی فوج پر لرزہ طاری ہو گیا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر ابوسفیان کا حوصلہ پست ہو گیا اور اس نے قریش سے کہا کہ تم لوگ اس مقام پر خیمہ زن ہوئے ہو جہاں ہمارے جوتے ٹوٹ گئے ہیں۔ بنو قریظہ نے ہم سے عہد شکنی کی۔ ادھر آندھی نے ہمیں کسی کام کا نہیں رکھا ہے اس لئے میری رائے تو یہ ہے کہ اب ہم مکہ کو واپس ہو جائیں۔ یہ کہہ کر ابوسفیان اُونٹ پر سوار ہوا اور نہایت گھبراہٹ کی حالت میں مکہ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا

فتح مکّہ اور ابوسفیان

سنہ ۶ ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کرنے کے لئے مدینہ سے روانہ ہوئے باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک مقدس فریضہ ادا کرنے تشریف لے جا رہے تھے اور آپ نے جنگ کی تیاری بھی نہیں کی تھی۔ مگر قریشِ مکّہ نے آپ کی تشریف آوری کو جنگ کا رنگ دے دیا اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش کے نمائندے حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے دریافت کیا کہ آپ کس غرض سے

تشریف لائے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ میں جنگ کرنے نہیں آیا ہوں۔ میرا مقصد صرف عمرہ ادا کرنا ہے۔ مگر قریش کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات کا یقین نہ آیا اور انہیں خیال پیدا ہوا کہ البیا نہ ہو آپ عمرہ کے بہانے ان کا شہر ہی فتح کرلیں۔ اس لئے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔

آخر بڑی بحث و مباحثہ کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ اس سال تو مسلمان بغیر عمرہ کئے واپس چلے جائیں، البتہ آئندہ سال انہیں عمرہ کرنے کی اجازت ہوگی۔

اس موقع پر ایک صلح نامہ مرتب کیا گیا، جس میں متعدد شرائط درج تھیں۔ ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونا چاہے وہ ان کے ساتھ ہو جائے اور جو قریش کے ساتھ ہونا چاہیے وہ ان کے ساتھ ہو جائے۔ اس صلح نامہ کے بعد بنی خزاعہ حضور کی سرپرستی میں اور بنی بکر قریش کی حمایت میں آگئے

کچھ عرصہ بعد بنو بکر کے ایک شخص نے بنو خزاعہ کے ایک شخص کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی میں آچکا تھا قتل کردیا۔

اس پر دونوں قبیلوں میں جنگ شروع ہوگئی۔ اور قریش نے صلح حدیبیہ کی اعلانیہ خلاف ورزی کرتے ہوئے بنو بکر کو امداد دی۔ بڑی خون ریز جنگ ہوئی اور بنو بکر اور قریش نے مل کر بنو خزاعہ کے بے شمار افراد کو قتل کر دیا۔

آخر بنو خزاعہ کا ایک نمائندہ فریاد لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے امداد کی درخواست کی۔ چونکہ قریش نے بنو خزاعہ پر حملہ کر کے، جو حضور کی سرپرستی میں آ چکے تھے صلح حدیبیہ کی ایک بڑی شرط کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی تھی۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عہد شکنی کے پیشِ نظر مکہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اِدھر ابوسفیان کو اندیشہ پیدا ہوا کہ ہماری طرف سے صُلح حدیبیہ کی ایک بڑی شرط کی خلاف ورزی ہوئی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم معاہدہ کے خاتمہ کا اعلان کر دیں چنانچہ وہ تجدیدِ عہد کی غرض سے مدینہ آیا۔

ابوسفیان کی ایک اور ناکامی

مدینہ پہنچ کر وہ سب سے پہلے اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا جو اس کی بیٹی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مکرمہ

تھیں۔ گھر میں داخل ہو کر جونہی وہ بستر پر بیٹھا اُمّ المومنین حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اس کے نیچے سے بستر کھینچ لیا اور کہا کہ تم جیسا ناپاک شخص اس قابل نہیں ہے کہ وہ رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس پاک بستر پر بیٹھے۔

اپنی بیٹی کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر ابوسفیان وہاں سے اُٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور آپ سے گفتگو کرنا چاہی، مگر حضور نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ تب وہ مایوس ہو کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور ان سے عرض کیا کہ میں تجدیدِ صلح کے لئے آیا ہوں۔ آپ اس باب میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا کر گفتگو کریں، مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد ابوسفیان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور ان سے بھی وہی گفتگو کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بڑی سختی سے جواب دیا کہ میں ہرگز تیری سفارش نہیں کروں گا۔ خدا کی قسم! میں تو اس وقت تک تیرے ساتھ جنگ کروں گا جب تک ایک تنکا بھی میرے پاس رہے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس سے ناکام ہو کر ابوسفیان حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے بھی

وہی عرض کیا جو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہم) سے کہہ چکا تھا اور یہ بھی کہا کہ اس وقت میں ایک سائل کی حیثیت سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ اگر میں آپ کے پاس سے بھی ناکام واپس گیا تو میری بہت ذلت ہوگی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں ایسے کسی طریقہ سے واقف نہیں ہوں جو تمہارے لئے مفید ہو۔ البتہ یہ کرو کہ مسلمانوں کے درمیان کھڑے ہو کر اعلان کر دو کہ میں تمہارے اور اپنے درمیان پناہ قائم کرتا ہوں۔

چنانچہ ابوسفیان نے ایسا ہی کیا اور پھر مکہ کو چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر قریش نے پوچھا کہ کیا کر کے آئے ہو۔ ابوسفیان نے جواب دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو مجھ سے بات نہیں کی۔ اس کے بعد میں حضرت ابوبکر کے پاس گیا مگر ان میں بھی اپنے لئے کوئی فلاح نظر نہیں آئی پھر میں حضرت عمر کے پاس گیا تو وہ سب سے زیادہ سخت نکلے اس کے بعد میں حضرت علی سے ملا۔ (رضی اللہ عنہم) البتہ انہیں میں نے بہت نرم مزاج پایا۔

انہوں نے مجھے ایک طریقہ سمجھایا وہی میں نے اختیار کیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ علی (رضی اللہ عنہ) نے تمہیں کون سا طریقہ بتایا ابوسفیان نے کہا کہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم مسلمانوں کے درمیان

کھڑے ہو کر پناہ کا اعلان کر دو۔ چنانچہ میں نے یہ اعلان کر دیا۔ اس پر لوگوں نے پوچھا کہ اس پناہ کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی تسلیم کیا۔ ابوسفیان نے کہا انہوں نے تو تسلیم نہیں کیا۔ اس پر قریش نے کہا اے ابوسفیان! علی رضی اللہ عنہ نے تجھ سے مذاق کیا۔

ابوسفیان اسلام قبول کرتا ہے

قریش مکہ کی طرف سے صلح حدیبیہ کی کھلم کھلا خلاف ورزی دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کا لشکر مرتب کیا اور مکہ کی جانب کوچ کر دیا۔ مکہ سے تھوڑی دُور ظہران کے مقام پر پہنچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کو پڑاؤ کرنے کا حکم دیا۔ شاید اہلِ لشکر نے کھانا وغیرہ تیار کرنے کے لئے آگ روشن کی۔

اس کی روشنی دُور دُور تک پہنچی۔ چنانچہ مکہ والوں نے بھی یہ روشنی دیکھی۔ اور ان کی طرف سے ابوسفیان ایک شخص بدیل بن ورقا کو لے کر حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لئے آیا۔ دونوں مسلمانوں کے لشکر سے تھوڑی دُور بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ اتنی تیز روشنی کس چیز کی ہو سکتی ہے کہ اتنے میں حضرت

عباس رضی اللہ عنہ کا اِدھر سے گذر ہوا۔ انہوں نے ابوسفیان کی آواز پہچان لی۔ دُور سے پُکار کر کہا اے ابوسفیان! تجھ پر خرابی آئے، تجھے معلوم نہیں کہ یہ رسُولِ خُدا کا لشکر ہے اور وقت آگیا ہے کہ قریش ہلاک کئے جائیں۔

ابوسفیان حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی گفتگو سُن کر گھبرا گیا اور ان سے کہنے لگا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان بچاؤ کا کوئی طریقہ بتائیے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر کسی مسلمان نے تجھے دیکھ لیا تو سر قلم کئے بغیر نہ چھوڑے گا اس لئے تو میرے خچّر پر بیٹھ جائیں تجھے رسول اللہ کے سامنے پیش کر کے سفارش کروں گا کہ اسے امن دی جائے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ، ابوسفیان کو اپنے خچّر پر بٹھا کر حضور کی خدمت میں لے چلے۔ راستے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملے انہوں نے ابوسفیان کو پہچان لیا اور دیکھتے ہی بولے، کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنے دشمن (ابوسفیان) پر مجھے قابو عطا فرمایا۔ یہ کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑے تاکہ حضور سے ابوسفیان کے قتل کی اجازت لے لیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے خچّر کو تیزی سے دوڑایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پہنچنے سے قبل ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم

سے اس کے لئے امن حاصل کر لیں۔

حضرت عباس فرماتے ہیں کہ میں حضرت عمر سے پہلے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اتنے میں حضرت عمر بھی پہنچ گئے اور حضورؐ سے عرض کیا کہ حضورؐ ابوسفیان ہمارے قابو میں آگیا ہے اور ہم نے اس سے جاں بخشی کے متعلق کوئی پیمان بھی نہیں کیا ہے۔ اس لئے آپ مجھے اسے قتل کرنے کی اجازت عطا فرمائیے۔

اتنے میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بولے کہ یارسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میں نے اسے امان دی ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے درمیان اس بارے میں کچھ بحث ومباحثہ ہوا۔ جسے سُن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عباس! اس وقت تو تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ، جب صبح ہو تو اسے میرے سامنے پیش کرنا۔

دوسرے روز صبح کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ ابوسفیان کو لے کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے ابوسفیان! تجھ پر خرابی آئے، کیا تیرے نزدیک ابھی وقت نہیں آیا کہ تُو

خدا کے وحدہٗ لاشریک ہونے کا اقرار کرے۔

ابوسفیان بولا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ کتنے حلیم و بردبار ہیں۔ اب مجھے یقین آگیا ہے کہ خدا کے سوائے اور کوئی معبود نہیں ہے۔ اگر کوئی اور معبود ہوتا تو میں ضرور کامیاب ہوتا۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر اس کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ اے ابوسفیان! کیا اب بھی تجھے میری رسالت پر یقین نہیں آیا۔ ابوسفیان نے جواب دیا کہ میرے ماں باپ حضور پر قربان، آپ کتنے کریم النفس اور بردبار ہیں اور کس قدر صلۂ رحمی کرتے ہیں۔ مگر میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ کی رسالت کے متعلق میرے دل میں شک ہے۔ یہ سُن کر حضرت عباس نے ابوسفیان سے کہا کہ کمبخت تجھ پر خرابی آئے کہہ دے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ چنانچہ ابوسفیان نے جلدی سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، کہہ کر اسلام قبول کر لیا۔

ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی دشمنی میں اپنے شوہر سے بھی پانچ ہاتھ آگے تھی۔ چنانچہ جب ابوسفیان نے مکہ آکر اعلان کیا کہ لوگو

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اتنا بڑا لشکر لے کر آگئے ہیں جس کا مقابلہ تمہارے بس سے باہر ہے۔ اس لئے جو شخص اپنی جان کی خیر چاہتا ہے وہ میرے گھر میں آجائے تو ہندہ نے آگے بڑھ کر ابوسفیان کی مونچھ پکڑ لی اور قریش سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ اس مسٹنڈے پہلوان کو قتل کر دو جو ایک معمولی لشکر کو دیکھ کر بدحواس ہو گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے اسی بدترین دشمن ابوسفیان کے بیٹے امیر معاویہ تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت ترین دشمن ہندہ، امیر معاویہ کی ماں تھیں۔ یہ بھی اپنے باپ کے ساتھ اسلام لے آئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ایک زمانہ میں اسلام کی زبردست خدمت بھی کی۔ مگر واقعات شہادت دیتے ہیں کہ ان کا دل بھی اپنے باپ کی طرح بنو ہاشم کی طرف سے صاف نہیں تھا۔

اور جس جذبہ کے تحت ان کے باپ ابوسفیان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو ناکام بنانے کی کوشش کی، اسی جذبے کے تحت ابوسفیان کے بیٹے امیر معاویہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی اور داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اسلامی حکومت کے قیام واستحکام میں زبردست رکاوٹیں

ڈالیں۔ اور اُمّتِ مسلمہ میں نفاق و انتشار پیدا کر کے ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کے خون سے سرزمینِ عرب کو لالہ زار بنا دیا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ امیر معاویہ کو بنو ہاشم کا اقتدار ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

یہ کوئی نئی یا عجیب بات نہ تھی، اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں بنو امیہ میں سے ایک نہ ایک شخص بنو ہاشم کی مخالفت کے لئے میدان میں ضرور نکلتا رہا۔ چنانچہ ہاشم کے مقابلے میں عبدشمس، عبدالمطلب کے مقابلے میں امیہ، ابوطالب کے مقابلے میں حرب، محمد رسول اللہ کے مقابلے میں ابوسفیان، حضرت علی کے مقابلے میں معاویہ، اور حضرت امام حسین کے مقابلے میں یزید طاقت آزمانے کے لئے میدان میں نکلتے رہے۔

کیا واقعات کے اس طویل سلسلے کو محض اتفاق قرار دیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دو مختلف مکاتیبِ فکر کا ٹکراؤ اور خیر و شر کا معرکہ تھا جو مختلف زمانوں میں ظہور پذیر ہوتا رہا۔ اور اس کی بنیاد نسلی یا قبائلی دشمنی پر تھی۔ اسی نسلی عصبیت نے امیر معاویہ کو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی مخالفت پر آمادہ کیا اور وہ ایک خلیفۂ راشد کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

معاویہ
بن
ابوسفیانؓ

معاویہ بن ابوسفیان

سیدنا حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے مختصر سے عہدِ خلافت میں جو واقعات رونما ہوئے۔ ان کا امیر معاویہ کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے اس سب سے بڑے حریف کے حالاتِ زندگی اور اس کی شخصیت پر ایک اجمالی تبصرہ کر دیا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ جس شخص سے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا سابقہ پڑا وہ کس مرتبہ اور کس مسلک کا آدمی تھا۔

ابتدائی حالات

امیر معاویہ بنو امیہ کے سردارِ قبیلہ ابوسفیان بن حرب کے بیٹے تھے۔ وہ مکہ میں بعثت نبوی سے دو سال قبل ۶۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر (۲۳) تئیس سال کی تھی کہ ان کے والد کی انتہائی کوشش کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے۔ اور ابوسفیان، ہندہ، امیر معاویہ اور ان کے بھائی یزید بن ابوسفیان نے

بادل ناخواستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قبول کی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تالیفِ قلوب کے طور پر امیر معاویہ کو اپنا کاتب مقرر کر لیا۔

یہ امر بحث طلب ہے کہ امیر معاویہ کاتبِ وحی تھے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممالک غیر سے جو مراسلت فرماتے تھے، اس کی کتابت کا فریضہ ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ بہر حال ایک قلیل مُدّت کے لئے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب رہنے کا شرف ضرور حاصل ہوا۔

معاویہ مسندِ امارت پر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رومیوں کی سرکوبی کے لئے جو چار لشکر مرتب فرمائے ان میں سے ایک لشکر کا قائد امیر معاویہ کے بھائی یزید بن ابوسفیان کو مقرر کیا۔ امیر معاویہ بھی اس لشکر میں شامل تھے اور ہراول دستے کے کمانڈر تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مہم میں یزید بن ابوسفیان اور امیر معاویہ دونوں نے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔

دمشق اور اس کے مضافات کی فتح میں گو زیادہ حصّہ

یزید بن ابوسفیان کا تھا۔ مگر ان معرکوں میں امیر معاویہ کی جنگی خدمات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ جب دمشق فتح ہو گیا اور اسلامی فوجوں نے اردگرد کے مقامات پر بھی اسلامی پرچم لہرا دیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یزید بن ابوسفیان کو ان علاقوں (دمشق اور مضافات) کا گورنر مقرر کیا۔

۱۸ھ میں یزید بن ابوسفیان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ کو دمشق اور اس کے مضافات کا گورنر مقرر فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے تو انہوں نے امیر معاویہ کو سارے شام کا گورنر بنا دیا۔

اسلامی فتوحات میں امیر معاویہ کا حصّہ

امیر معاویہ کا سخت سے سخت ناقد بھی اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہم) کے عہد میں جو اسلامی فتوحات ہوئیں ان میں امیر معاویہ نے بڑا اہم رول ادا کیا۔

دمشق کی فتح کے بعد جب یزید بن ابوسفیان نے عرقہ،

جبیل، بیروت اور صیدا کی طرف پیش قدمی کی تو ان مہمات میں ہراول دستوں کی قیادت امیر معاویہ ہی نے کی اور عرقہ کی فتح کا سہرا تو انہی کے سر بندھتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دور میں شام کے بعض علاقوں میں جب زبردست بغاوت رونما ہوئی اور متعدد شہر اسلامی سلطنت سے نکل گئے تو حضرت عمر نے امیر معاویہ ہی کو ان علاقوں کی بازیابی پر مقرر فرمایا اور امیر معاویہ نے بڑی بہادری سے یہ سارے علاقے دشمن کے قبضہ سے نکال کر از سر نو اسلامی مملکت میں شامل کئے۔

امیر معاویہ نے جو مہمات سر انجام دیں ان میں قیساریہ کی مہم بڑی اہم تھی۔ قیساریہ رومیوں کی زبردست چھاؤنی تھی۔ جہاں سے نکل نکل کر وہ اسلامی سلطنت پر حملے کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ کو حکم دیا کہ قیساریہ کی تسخیر کے لئے روانہ ہو جاؤ۔

معاویہ آزمودہ کار عربوں کا ایک لشکر لے کر قیساریہ پہنچے رومی سپہ سالار نے ان کا زبردست مقابلہ کیا مگر آخر کار شکست کھا کر قلعہ بند ہو گیا۔ معاویہ نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس دوران میں رومیوں نے شہر سے نکل کر امیر معاویہ کے لشکر پر

متعدد حملے کئے مگر انہیں ہر حملے میں شکست کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ آخر ایک شدید جنگ کے بعد رومیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور قیساریہ پر امیر معاویہ نے قبضہ کر لیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں امیر معاویہ کو اپنے جوہر دکھانے کا خوب موقع ملا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں شام کا گورنر مقرر کرنے کے علاوہ جنگی امور کا نگران بھی مقرر کر دیا تھا۔ اپنی اس حیثیت سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے طرابلس، الشام، ملطیہ، عموریہ، شمشاط اور قبرص تک اسلامی سلطنت کو وسیع کر دیا۔

امیر معاویہ بحیثیت بادشاہ

سنہ ۴۱ھ میں جب امیر معاویہ تمام عالم اسلام کے مطلق العنان فرماں روا ہو گئے تو انہوں نے اسلامی سلطنت کی توسیع کی طرف خاص توجہ دی۔ ان کے حکمراں ہونے کے بعد بلخ، ہرات اور باذغیس وغیرہ میں زبردست بغاوت رونما ہوئی، امیر معاویہ کے حکم سے قیس بن ہیثم کو ان بغاوتوں کے ختم کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اور قیس نے بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے ایک ایک بغاوت کو ختم کر کے سارے شہروں پر قبضہ کر لیا۔

اسی طرح کابل اور غور کے علاقوں کے لوگوں نے بھی ۴۷ھ میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ مگر امیر معاویہ کے جرنیلوں عبدالرحمٰن بن سمرہ اور حکم بن عمرو غفاری نے ان بغاوتوں کو بھی ٹھنڈا کر دیا اور ان علاقوں میں مکمل امن و امان قائم ہو گیا۔

ان بغاتوں کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ امیر معاویہ نے اپنے جرنیلوں کو ان علاقوں کو فتح کرنے کا بھی حکم دیا جو ابھی تک اسلامی سلطنت میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اور موقع ملنے پر ان علاقوں کے حکمران مسلمانوں پر چڑھائی کرتے رہتے تھے۔ زران، غور، غزنہ، طخارستان، رامنی اور بیکند کے علاقے ایسے ہی حکمرانوں کے زیرِ تسلط تھے جن کی سرکوبی کی سخت ضرورت تھی، تاکہ مسلمان اُن کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔

چنانچہ امیر معاویہ کے جرنیلوں نے ان علاقوں پر حملے کر کے انہیں بھی سلطنتِ اسلامی میں شامل کر لیا۔ ان فتوحات سے امیر معاویہ کے جرنیلوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور انہوں نے ترکستان کا رخ کیا اور سمرقند، بخارا، نسف، ترمذ، اور اس کے مضافات پر حملے شروع کر دیئے۔ ان علاقوں کے لوگوں نے بڑی بہادری اور پامردی سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا اور بعض جگہ بڑی خونریز جنگیں ہوئیں۔ مگر یہاں بھی میدان امیر معاویہ کے جرنیلوں

ہی کے ہاتھ رہا۔

امیر معاویہ کی انتظامی قابلیت

امیر معاویہ زبردست انتظامی قابلیت کے مالک تھے۔ حکمرانی کی صلاحیتیں ان میں بدرجہ کمال پائی جاتی تھیں۔ انہوں نے بیس سال تک شام کی گورنری اور بیس ہی سال تک سارے عالمِ اسلام پر حکمرانی کی۔

اپنے عہدِ حکمرانی میں انہوں نے فوج، سیاست اور دفتری نظام میں متعدد اصلاحات کیں۔ ان کی طبیعت میں اختراع کا بے حد مادہ تھا۔ اس لیے انہوں نے متعدد جدید شعبے قائم کئے اور حقیقت یہ ہے کہ ان شعبوں کے قیام سے ملکی انتظام نہایت بہتر ہو گیا۔

فوجی انتظامات

انہوں نے فوج کی تنظیم کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی، تمام سرحدی مقامات پر چھاؤنیاں قائم کیں اور تمام بڑے بڑے شہروں میں مستحکم قلعے بنوائے۔ شام، مدینہ، مرقیہ طرطوس اور روڈس کے مضبوط قلعے جو امیر معاویہ نے حفاظتی

مقاصد کے لئے تعمیر کرائے تھے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے قلعے جو ان کے پیش رو خلفاء نے بنوائے تھے اور کسی وجہ سے ویران یا مسمار ہو گئے تھے۔ امیر معاویہ نے ان کی مرمت کرا کر دوبارہ قابلِ استعمال بنایا۔

بعض نئے شہر بھی امیر معاویہ نے آباد کرائے اور بعض مقبوضہ علاقوں میں مسلمانوں کو کثیر تعداد میں آباد کرایا۔ تاکہ وہاں کی مقامی آبادی شر انگیزی نہ کر سکے۔ امیر معاویہ کے آباد کردہ شہروں میں مرعش اور قیروان کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

بحری بیڑے کا قیام

امیر معاویہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مسلمانوں کا بحری بیڑہ قائم کیا۔ اس بحری بیڑے کو ترقی دینے کے لئے انہوں نے جہاز سازی کے متعدد کارخانے قائم کئے۔ انہوں نے بحری بیڑے کو برّی فوج سے علیحدہ کر کے ایک مستقل شعبہ کی حیثیت دی۔ اور اس کا الگ کمانڈر انچیف مقرر کیا جسے امیر البحر کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ سب سے پہلا امیر البحر جسے تاریخِ اسلام کا سب سے پہلا امیر البحر کہنا چاہیئے، عبد اللہ بن قیس حارثی تھا

ڈاک کا انتظام

امیر معاویہ نے اپنے عہدِ حکومت میں جو اصلاحات کیں ان میں ڈاک کے انتظام کی بہتری خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ڈاک کی چوکیاں قائم کیں جن کا جال ساری سلطنت میں پھیلا ہوا تھا۔ ان چوکیوں میں برق رفتار گھوڑے ہر وقت موجود رہتے تھے جن کے ذریعے سے ڈاک ایک شہر سے دوسرے شہر تک نہایت آسانی اور بہت تیزی سے پہنچتی رہتی تھی۔ ملکی حالات سے باخبر رہنے کے لئے انہوں نے تمام بڑے بڑے شہروں میں پرچہ نویس مقرر کر دیئے تھے۔ جو چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کی اطلاع بھی امیر معاویہ تک پہنچاتے رہتے تھے۔

زرعی ترقی کیلئے اقدامات

امیر معاویہ کو ملک کی خوش حالی اور فارغ البالی کا بڑا خیال رہتا تھا، اور وہ خوب جانتے تھے کہ اس کا سب سے زیادہ انحصار زراعت پر ہے۔ چنانچہ انہوں نے زراعت کی ترقی کے لئے متعدد نہریں کھدوائیں اور برساتی پانی کو محفوظ کرنے

کے لئے تالاب بنوائے۔ یہ تالاب اور نہریں شام، حجاز خراسان اور ترکستان میں بکثرت تعمیر کروائی گئیں۔ بعض جگہ ان نہروں کے لئے پہاڑوں تک کو کاٹنا پڑا اور پہاڑ کاٹ کر نہریں نکالی گئیں۔

دفتر خاتم

امیر معاویہ کے عہد حکومت میں ایک نیا انتظامی شعبہ قائم ہوا جس کا اس سے پہلے وجود نہیں تھا۔ یہ شعبہ دفتر خاتم کہلاتا تھا۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک شخص کو امیر معاویہ نے ایک لاکھ درہم دینے جانے کا حکم لکھا۔ اس شخص نے یہ حکم نامہ کھول کر پڑھا اور اس میں ایک لاکھ کو دو لاکھ بنا کر دوگنی رقم وصول کر لی۔

جب امیر معاویہ کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے حکم دیا کہ آئندہ سے میرے ہر فرمان کی ایک نقل دفتر میں رکھی جایا کرے تاکہ راستے میں اسے کوئی نہ کھول سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک نیا شعبہ قائم کیا گیا۔ اس شعبہ کو دفتر خاتم کہا جاتا تھا۔

داخلی امن کی کوششیں

امیر معاویہ اس نکتے سے خوب واقف تھے کہ جب تک ملک کے اندر امن وامان نہیں ہو گا اور لوگ بے خوف و مطمئن نہیں ہوں گے، اس وقت تک ملک کو استحکام حاصل نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے محکمہ پولیس کی تنظیمِ نو کی طرف خاص توجہ دی۔ اور اس کی تعداد میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ پولیس افسروں کے اختیارات بھی وسیع کئے۔ فسادی اور بد معاش عنصر کی نگرانی کا خاص اہتمام کیا۔ اور اپنے عمال کو حکم دیا کہ ہر شہر میں اوباش اور مفسد لوگوں کو تلاش کر کے ان کے نام رجسٹر میں درج کئے جائیں اور ان کی نقل وحرکت پر کڑی نظر رکھی جائے۔ پولیس کی ایک جماعت کی ڈیوٹی صرف یہ تھی کہ وہ گلیوں اور بازاروں میں گشت کر کے بدمعاشوں کی نگرانی کیا کرتی تھی۔

امیر معاویہ کی شخصیت

امیر معاویہ کا عہدِ حکومت اور ان کی انتظامی قابلیت

کو دیکھ کر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ قدرت کی طرف سے غیر معمولی دل و دماغ لے کر آئے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے سیاست داں، بہت بڑے مدبر اور بہت بڑے منتظم تھے۔ بلکہ ان جیسی شخصیت عالم اسلام میں ان کے بعد کم ہی پیدا ہوئی۔ ان میں لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی غیر معمولی صلاحیت تھی اور مردم شناسی میں تو وہ اپنے نظیر آپ تھے۔

انہوں نے جن لوگوں کو اپنا دست و بازو بنایا وہ بھی انہیں کی طرح تدبر و فراست اور سیاست دانی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ اور زیاد بن ابیہ عرب کے وہ عاقل تھے، جنہوں نے امیر معاویہ کے راستے کی ساری رکاوٹوں کو دُور کر دیا۔ ان کی تمام مشکلوں کو آسان کر دیا اور ان کی سلطنت کو زبردست استحکام بخشا۔

معاویہ حلم و بُردباری اور فیاضی کی صفات سے بھی متصف تھے۔ ان کا دستر خوان بھی بڑا وسیع تھا۔ اپنے مخالفوں کو زیر کرنے کے لئے ان کا سب سے بڑا ہتھیار روپیہ تھا۔ وہ دولت سے اپنے بڑے بڑے دُشمنوں کا مُنہ بند کر دیا کرتے تھے۔ انکی بردباری اور حلم تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک بار انہوں نے

بعض سرداران قبائل میں درہم و دینار تقسیم کئے، ان میں سے ایک سردار کو کچھ کم ملا۔ اس سردار نے اس تھوڑی رقم کو اپنی ہتک سمجھا اور اپنے بیٹے کو درہموں کی وہ تھیلی دے کر کہا کہ یہ لے جا کر معاویہ کے منہ پر مار دینا۔ بیٹا باپ کے حکم کی تعمیل میں معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ان سے کہا کہ آپ نے میرے والد کو جو رقم دی ہے وہ دوسرے سرداروں سے کم ہے اس لئے انہوں نے واپس کر دی ہے۔ اور مجھے حکم دیا ہے کہ یہ تھیلی میں آپ کے منہ پر ماروں۔

یہ سن کر امیر معاویہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور اس سے کہا کہ اے میرے بھتیجے! اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کرو، لیکن ذرا خیال رکھنا کہ تمہارا چچا اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ (یعنی تھیلی آہستہ سے مارنا)۔

لڑکے پر امیر معاویہ کی اس عدیم المثال بردباری کا اتنا اثر ہوا کہ تھیلی رکھ کر واپس چلا گیا اور اپنے والد کو سارا ماجرا سنایا۔ باپ معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے اس فعل پر سخت ندامت کا اظہار کیا۔

یہ امیر معاویہ کی وہ خوبیاں اور ان کے وہ کمالات ہیں جن کے اظہار میں بخل سے کام لینا سراسر تعصب ہے یا بددیانتی۔

لیکن اسی طرح ان کی شخصیت کے دوسرے پہلو کو چھپا لینا بھی پرلے درجے کا تعصّب اور بد دیانتی ہے۔ ان کی شخصیت کا متذکرہ پہلو جتنا روشن ہے، افسوس کہ دوسرا پہلو اسی قدر تاریک ہے۔

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ معاویہ اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ایک دنیادار حکمران تھے۔ ان کی ساری زندگی اس کی گواہ ہے کہ ان میں نسلی عصبیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک خلیفۂ راشد کی مخالفت صرف اس لئے کی کہ وہ بنو ہاشم میں سے تھے۔ اور بنو ہاشم سے ان کی خاندانی دشمنی تھی۔

امیر المومنین سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنا اور انہیں ایک ایسی جنگ پر مجبور کر دینا جس میں ہزاروں مسلمان خاک و خون میں تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہو گئے، امیر معاویہ کی اتنی بڑی خطا ہے جسے کسی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

بعض لوگ اسے امیر معاویہ کی اجتہادی غلطی قرار دے کر ان کی اس خطا کی نوعیت کو ہلکا کرنا چاہتے ہیں لیکن اس قسم کے لوگ اپنے نفس کو بھی فریب دیتے ہیں اور دوسرے

لوگوں کو بھی۔

خلیفۂ وقت سے بغاوت

جو لوگ امیر معاویہ کے باغیانہ اقدامات کے جواز میں یہ عذر تراشتے ہیں کہ امیر معاویہ کا خیال تھا کہ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سارے عالمِ اسلام نے نہیں کی ہے اس لئے مجھ پر بھی ان کو بیعت کرنا لازم نہیں آتا۔ اس قسم کے کوتاہ بین اور متعصب لوگوں سے ہم پوچھتے ہیں کہ کیا امیر معاویہ کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے انعقادِ خلافت کا طریقہ یہی تھا کہ جب اہلِ مدینہ کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے تھے تو اس کی خلافت قائم ہو جاتی تھی۔

کیا حضرت ابوبکر، حضرت عمر، اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہم) کی خلافت اہلِ مدینہ کی بیعت سے قائم نہیں ہوئی تھی۔ اور کیا یہ درست نہیں ہے کہ جب اہلِ مدینہ نے ان تینوں خلفاء کی بیعت کر لی تو سارے عالمِ اسلام پر ان کی بیعت کرنے کے لئے حُجّت قائم ہو گئی۔

اب رہا یہ امر کہ سارے اہلِ مدینہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی یا نہیں تو اس کا ثبوت ملاحظہ ہو۔

”حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے فوراً
بعد ذی الحجہ کے آغاز میں حضرت علی رضی اللہ عنہ
کی بیعت خلافت کی گئی۔ اس بیعت میں مدینہ
کا ہر وہ شخص شریک ہوا جو اس وقت مدینہ میں
موجود تھا۔ تمام اسلامی مملکتوں میں اس بیعت کی
اطلاع بھیجی گئی اور ہر شہر کے لوگوں نے برضا و رغبت
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت اختیار کی۔ صرف
معاویہ اور اہلِ شام نے انکار کیا۔“

•

اس مستند ترین حوالے سے صرف یہی ثابت نہیں ہوتا ہے کہ
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت اہلِ مدینہ نے کر لی تھی بلکہ اس
سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سوائے شام کے سارے عالم اسلام
نے آپ کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دیا تھا۔
اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ مدینہ کے دس پانچ افراد
نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی تو ان کے
بیعت نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں
کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے موقع پر رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار اور جیّد صحابی حضرت سعد بن عبادہ

رضی اللہ عنہ نے آپ کی بیعت کرنے سے انکار کیا تھا اور ان کے ساتھ ان کے قبیلے نے بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی۔

کیا اس سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ ان تھوڑے سے افراد کے بیعت نہ کرنے سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت قائم نہیں ہوئی۔ یہی مؤقف حضرت امام ابن تیمیہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں کہ:۔

"اور جن لوگوں نے ان (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کی بیعت نہیں کی ان کا بیعت نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے سعد بن عبادہ (رضی اللہ عنہ) کا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے انکار کرنا۔"

اس سے امام ابنِ تیمیہ کی مراد یہ ہے کہ جس طرح سعد بن عبادہ (رضی اللہ عنہ) نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی مگر اس کے باوجود حضرت ابو بکر کی خلافت قائم ہو گئی تھی۔ اس طرح اگر کچھ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تو اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت علی کی خلافت قائم نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ امام ابنِ تیمیہ اپنے مؤقف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

”حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اہلِ شوکت کی بیعت سے قائم ہوئی تھی۔ گو سارے عالمِ اسلام نے ان کی بیعت نہیں کی جیسے ان سے پہلے خلفاء کی بیعت کی گئی تھی (اور یہ بیعت نہ کرنے والے اہلِ شام تھے) لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اہلِ شوکت کی بیعت نے ان کی خلافت کو طاقت عطا کی تھی اور نص ظاہر کرتی ہے کہ ان کی خلافت خلافتِ نبوّت تھی“

•

امیر معاویہ کی غلطی کو خطائے اجتہادی قرار دینے والوں سے ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا خلافت نبوت سے بغاوت کرنا کوئی معمولی خطا ہے؟ اور کیا اسے صرف اجتہادی خطا کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امیر معاویہ کے مزاج میں سرکشی اور نافرمانی کا مادہ تھا۔ اور وہ خود اپنی خلافت کے خواب دیکھ رہے تھے، جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا۔

انہوں نے جان بوجھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے انحراف کیا اور اس طرح اُمت میں پہلی بار مرکز سے بغاوت

کرنے کی روایت قائم کی۔ جس نے سارے اسلامی نظام کو اُلٹ پلٹ کر دیا اور جنگ وجدل کا وہ لامتناہی سلسلہ چل نکلا جس نے عالمِ اسلام کی جڑیں ہلا دیں۔ انہوں نے اُمّت میں نفاق و انتشار پیدا کیا اور مسلمانوں کو مستقل طور پر دو بڑے گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ جو آج تک ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔

دولت کا بے جا مصرف

چونکہ امیر معاویہ نے بنیادی طور پر غلط قدم اٹھایا تھا، اس لئے اس غلط اقدام کے لئے انہوں نے جو سہارے لئے وہ بھی غلط تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ انہوں نے جس شخص کے خلاف بغاوت کی ہے وہ کوئی معمولی شخصیت کا حامل نہیں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں لوگوں کو اپنی طرف کھینچنا آسان نہ تھا۔ اس لئے اس مقصد کی خاطر انہوں نے تھیلیوں کے مُنہ کھول دیئے۔ اور وہ روپیہ جسے مسلمانوں کی امانت کہنا چاہیئے انہوں نے بڑی بے دردی سے سردارانِ قبائل کو رشوتیں دینے پر صرف کیا تاکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے

مقابلے میں وہ زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرسکیں۔

امیر معاویہ سے پہلے اسلام میں اس قسم کی بدعت کا سراغ نہیں ملتا ہے۔ کہ کسی خلیفۂ راشد نے اپنے مخالفوں کو زیر کرنے کے لئے رشوتیں دی ہوں۔ وہ قدسی نفوس اسلامی بیت المال کو اللہ کی امانت سمجھا کرتے تھے۔ اور باغیوں کو ہمیشہ تلوار سے سیدھا کرتے تھے۔ مگر امیر معاویہ نے خالصۃً دنیادار لوگوں کا طریقہ اختیار کر کے اپنے بعد آنے والوں کے لئے ایک بُری مثال قائم کی۔ چنانچہ ایک بڑا معتبر مؤرخ لکھتا ہے کہ:

"ایک بار امیر معاویہ نے بعض سردارانِ قبائل کو ایک لاکھ درہم دیئے۔ ان سرداروں میں ابو منازل بھی تھا جسے معاویہ نے پچھتر ہزار درہم عطا کیئے۔ یہ بات ابو منازل کو بہت ناگوار گزری اور اس نے معاویہ سے کہا کہ تم نے مجھے بنو تمیم میں ذلیل کردیا۔ کیا تم مجھے حسب نسب کے لحاظ سے ممتاز اور عمر کے لحاظ سے قابلِ عزت نہیں سمجھتے ہو اور کیا مجھے اپنی قوم کی سرداری کا فخر حاصل نہیں ہے"۔

اس پر امیر معاویہ نے کہا کہ آپ ٹھیک کہتے

ہیں۔ مجھے آپ کے سارے فضائل کا اعتراف ہے
اس پر ابو منازل بولا پھر کیا وجہ ہے کہ تم نے
دوسرے سرداروں کے مقابلے میں مجھے کم رقم
دی۔

معاویہ نے جواب دیا کہ انہیں زیادہ رقم
دے کر میں نے ان کا دین بھی خرید لیا ہے اور
آپ چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے
مداحوں میں سے ہیں، اس لئے میں نے آپ
کا دین آپ کے پاس ہی رہنے دیا ہے۔ اس پر
ابو منازل نے کہا کہ تم میرا دین بھی خرید لو۔ چنانچہ
معاویہ نے ابو منازل کو بھی اتنی ہی رقم دے دی،
جتنی دوسروں کو دی تھی۔"

•

یہ ایک مثال ہے جو ہم نے بطور نمونہ پیش کی ہے ورنہ
حقیقت یہ ہے کہ امیر معاویہ کی ساری زندگی اس قسم کے
واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اور بلا شبہ یہ ان کی سیاست
کا افسوسناک پہلو ہے۔ یہ طرزِ سیاست لوگوں کو عارضی طور پر
تو بادشاہوں کا مطیع بنا دیتا ہے لیکن اس اطاعت کو مستقل

اور مخلصانہ اطاعت نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہ طریق کار بعد میں آنے والے حکمرانوں کے لئے بڑی مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔

سودا بازی

امیر معاویہ کی سیاست کا ایک افسوسناک پہلو سیاسی سودے بازی ہے۔ وہ ہر اس شخص سے گٹھ جوڑ کر لیتے تھے جو ان کی مطلب برآری کے لئے مفید ہوتا تھا۔ انہوں نے سردارانِ قبائل اور بعض سر کردہ لوگوں کو رشوتیں دے دے کر اس لئے اپنے ساتھ ملا لیا کہ انہیں ان لوگوں سے حصولِ مقصد میں اعانت کی توقع تھی۔

امیر معاویہ کو خوب معلوم تھا کہ عمرو بن العاص اپنی غیر معمولی فراست اور سیاست کے لحاظ سے عرب کے معدودے چند لوگوں میں سے ہیں۔ اگر وہ میرے ہمنوا ہو جائیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ناکام بنانا آسان ہو جائے گا۔

چنانچہ انہوں نے عمرو بن العاص کو فلسطین سے بلوایا اور امداد کی درخواست کی۔ عمرو بن العاص نے ان کی امداد کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ مگر شرط یہ رکھی کہ اگر میں مصر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قبضے سے نکال لوں تو مجھے اس کا گورنر بنا دیا

جلئے۔ اور عمر پھر اس عہدہ پر برقرار رکھا جلئے۔ چنانچہ معاویہ نے عمرو بن العاص کی یہ شرط منظور کرلی۔

کیا اس طریق کار کو سودا بازی کے علاوہ کسی اور نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ اور کیا اس طریق کار سے دونوں کے کردار کا کوئی قابلِ تعریف نقش دل پر قائم ہوتا ہے؟ یہ بھی خیال رہے کہ یہ سودا بازی کس کے خلاف ہو رہی ہے؟ اُس شخص کے خلاف جسے سوائے شام کے ساری اُمّت خلیفہ تسلیم کر چکی ہے۔ جو اپنی نیک نفسی، پارسائی، تقویٰ اور قربتِ رسول کے لحاظ سے ساری اُمّت میں ممتاز ہے۔

اور جس کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ارشاد ہے کہ: "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان لوگوں سے زیادہ خلافت کا کوئی حق دار نہیں ہے۔ جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وصال کے وقت تک خوش رہے۔ پھر (حضرت عمر نے) حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت طلحہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہم) کے نام لئے۔"

خیال رہے کہ ان لوگوں میں امیر معاویہ کا نام سرے سے

موجود ہی نہیں ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام سرِفہرست ہے۔

پروپیگنڈے کا طریقہ

امیر معاویہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سب سے بڑا اختلاف یہ تھا کہ انہوں نے قاتلانِ عثمان رضی اللہ عنہ سے انتقام نہیں لیا۔ گویا ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی۔ قطع نظر اس کے کہ جن حالات میں یہ واقعہ پیش آیا تھا ان میں انتقام لیا جا سکتا تھا یا نہیں۔ اور پہلے مقتول خلیفہ کا انتقام لینا ضروری تھا یا سلطنت کو مستحکم کرنا اور امن وامان قائم کرنا۔

غور طلب امر یہ ہے کہ امیر معاویہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے انتقام لینے کا حق کس نے دیا۔ کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بیٹے نہیں تھے۔ ان کے اصل وارث تو ان کے بیٹے تھے۔ اور ان کی طرف سے انتقام لینے کا مطالبہ کسی حد تک معقولیت پر مبنی قرار دیا جا سکتا تھا۔ لیکن امیر معاویہ کے ساتھ تو حضرت عثمان کا کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ پھر ان کا انتقامِ عثمان کا مطالبہ کہاں تک جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ

کہا جائے کہ مظلوم اور مقتول خلیفہ کے انتقام لینے کا مطالبہ ہر مسلمان کی طرف سے ہو سکتا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ انتقام لینے کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ اس معاملہ کو حاکمِ وقت کے سامنے پیش کرنا چاہیئے تھا۔

اگر امیر معاویہ کا یہ مطالبہ اخلاص پر مبنی تھا تو انہیں چاہیئے تھا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کرتے۔ ان کی بیعت کرتے اور ان کی خلافت کو مستحکم کرنے میں ان کی امداد کرتے۔ جب پوری طرح نظم ونسق قائم ہو جاتا تو پھر ایک ایک قاتل کو گرفتار کر کے اسے اس کے کیفرِ کردار تک پہنچایا جاتا۔ مگر امیر معاویہ نے اس معقول اور صحیح طریقے کے بجائے نہایت غلط اور حد درجہ قابلِ اعتراض طریقہ اختیار کیا۔

انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خون آلود قمیص اور حضرت عثمان کی بیوی نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں دمشق کی جامع مسجد میں رکھ کر اس واقعہ کی خوب تشہیر کی۔ لوگ آتے اور ان چیزوں کو دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر روتے۔ گویا بجائے اس کے کہ اس واقعہ کے بُرے اثرات کو زائل کر کے لوگوں کے جذبات کو اعتدال پر لاتے اور سلطنت میں قیامِ امن کی

کوشش کرتے۔ انہوں نے لوگوں کے جذبات کو اور زیادہ مشتعل کیا تاکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف اچھی طرح آگ لگائی جائے، اور ان کی خلافت کو استحکام نہ ہونے پائے۔

کیا پروپیگنڈے کا یہ طریقہ کسی طرح بھی اسلامی سیاست کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ امیر معاویہ خونِ عثمان رضی اللہ عنہ پر اپنا قصرِ خلافت تعمیر کرنے کی کوشش کر رہے تھے، چنانچہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بھی اس معاملے میں یہی رائے تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑے زیرک آدمی تھے۔ وہ امیر معاویہ کے اس مطالبے کی تہہ تک پہنچ گئے تھے اور جب معاویہ نے انہیں خط لکھ کر قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب میں لکھا کہ:

"تم ہرگز خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے طالب نہیں ہو۔ اسے تم اپنے مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ بنا رہے ہو۔"

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ رائے سو فیصد درست تھی۔ سطورِ بالا میں ہم نے امیر معاویہ کی سیاست کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے یہ امر بآسانی سمجھ میں

آسکتا ہے کہ ان کا مقصد و مدعا صرف یہ تھا کہ کسی طرح خلافت پر قبضہ کر لیں۔

اس مقصد کے لئے انہوں نے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا۔ اپنی ذاتی غرض پوری کرنے کے لئے ہزاروں مسلمانوں کا بڑی بے دردی سے خون بھی بہایا۔ مسلمانوں کی امانت (بیت المال) کو بے دریغ صرف کیا، گھٹیا قسم کا پروپیگنڈہ بھی کیا۔ اور لوگوں سے سیاسی سودے بازی بھی کی۔ یورپ کا مشہور مستشرق "نکلسن" امیر معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرزِ سیاست کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑے دانشمند، نہایت صائب الرائے بہت بڑے مدبّر، بڑی بالغ نظر رکھنے والے۔ ایفائے عہد کے پابند اور اپنے دشمن کے ساتھ بھی نہایت شریفانہ سلوک کرنے والے تھے۔ مگر وہ اپنی حکومت کے لئے وہ حربے استعمال کرنا پسند نہ کرتے تھے جنہیں ان کے حریف (معاویہ وعمرو بن العاص وغیرہم) بڑی آزادی سے استعمال کرتے تھے۔ ان کی سیاست چالبازی کی سیاست نہ تھی"

امیر معاویہ کی لغزشوں کی فہرست یہیں ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ امام حسن رضی اللہ عنہ جیسے امن پسند اور نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف فوج کشی کا اقدام اور پھر زندگی کے آخری دور میں اپنے اوباش اور بدکردار بیٹے یزید کو اُمّت کے سر پر مسلط کر جانا، امیر معاویہ کے وہ سنگین اقدامات ہیں جن کے لئے کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔

ان کے اس آخری اقدام سے تو اُمّتِ مسلمہ کو بے حد نقصان پہنچا اور مسلمان خلافتِ راشدہ کی اس نعمت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے، جو اپنے دامن میں بڑی برکتیں رکھتی تھی۔

خلافت

سے

دست برداری

خلافت سے دست برداری

جیسا کہ گذشتہ باب کے آغاز میں لکھا جا چکا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب اہلِ کوفہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور امیر معاویہ کو اس بیعت کی خبر ہوگئی تو انہوں نے عراق پر لشکر کشی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنے ایک آزمودہ کار جرنیل عبداللہ بن عامر بن کریز کو ہراول دستے کے طور پر انہوں نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی طرف روانہ کیا۔

اس وقت حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کوفہ میں تشریف فرما تھے جب انہیں امیر معاویہ کے ہراول دستے کی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے بھی قیس بن عامر کو ایک لشکر دے کر مدائن کی طرف بھیجا جہاں امیر معاویہ کا جرنیل عبداللہ بن عامر بن کریز خیمہ زن تھا۔ اور جلد ہی خود بھی ایک لشکرِ جرار لے کر مدائن کی طرف روانہ ہو گئے۔

ساباط کے مقام پر پہنچ کر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے اہلِ لشکر کے سامنے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے فرمایا کہ میرے دل میں کسی مسلمان کے خلاف کینہ نہیں ہے اور میں کسی کے لئے وہ چیز پسند نہیں کرتا ہوں جو خود مجھے اپنے لئے پسند نہیں ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم لوگ تفرقہ و اختلاف کے بجائے اتحاد و اتفاق کو قبول کرلو۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی اس تقریر میں واضح طور پر امیر معاویہ کے ساتھ صلح کرنے کا اشارہ پایا جاتا تھا۔ اس لئے آپ کی یہ تقریر ان لوگوں کو ناگوار گزری جو امیر معاویہ کے ساتھ جنگ کرنے کی قسم کھا چکے تھے۔

خارجیوں کا رویّہ

تاریخ میں ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی یہ تقریر سُن کر لوگوں پر سناٹا چھا گیا مگر سوائے خارجیوں کی ایک جماعت کے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو گئی اور کسی نے اپنے اختلاف کا اظہار نہیں کیا۔

چونکہ خارجی امیر معاویہ کو غاصب اور باغیٔ خلافت سمجھتے تھے اور ان سے جنگ کرنے کو مذہبی فرض کی حیثیت دیتے تھے، اس لئے یہ لوگ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی تقریر سن کر مشتعل ہو گئے مگر حضرت امام حسن کے اہلِ لشکر کے باقی لوگوں کا خیال تھا کہ ہم اپنے امام کے حکم کے پابند ہیں، اگر وہ اس جنگ کو پسند نہیں کریں گے تو ہم بھی جنگ نہیں کریں گے اور اگر وہ جنگ کرنے کا حکم دیں گے تو ہم اپنی جان قربان کر دیں گے۔

یہ دونوں طبقے اپنے اپنے نظریات پر بڑی شدت سے قائم تھے اور ایک موقع پر اس شدت نے کسی قدر نازک صورت اختیار کر لی۔ معمولی سی جھڑپ بھی ہوئی اور اس جھڑپ میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ بھی ایک خارجی کے نیزے سے زخمی ہو گئے۔ مگر آپ کے جاں نثاروں نے تلواریں سونت کر حالات کو درست کر لیا اور آپ کو مدائن کے قصرِ ابیض میں پہنچا دیا۔ جہاں چند روز زیرِ علاج رہنے کے بعد آپ صحتیاب ہو گئے۔

اسی دوران میں امیر معاویہ کے جرنیل عبداللہ بن عامر نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ اُمّتِ مسلمہ کو خونریزی سے بچانے کے لئے جنگ نہ کیجئے۔ ایک روایت کے مطابق خود امیر معاویہ نے بھی حضرت

امام کی خدمت میں لکھا کہ خونریزی سے اجتناب کیجئے اور جو شرائط آپ کو پسند ہوں ان پر خلافت سے دست بردار ہو جائیے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ کی درخواست قبول فرمالی۔ چند روز کے بعد امیر معاویہ بذاتِ خود کوفہ آکر حضرت امام حسن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حوالگی خلافت کے متعلق دونوں میں آمنے سامنے گفتگو ہوئی۔

دست برداری کا اعلان

اس کے بعد امیر معاویہ کی تحریک پر حضرت امام حسن نے مجمع عام میں دست برداری کا اعلان کرتے ہوئے کوفہ کی جامع مسجد میں ایک تقریر کی۔ جس میں فرمایا کہ:

"امابعد! دنیا میں جتنی دانائیاں ہیں، ان میں سب سے بہتر دانائی تقویٰ ہے اور جتنی کمزوریاں ہیں، ان میں سب سے بڑی کمزوری اعمال کی خرابی ہے۔ ہمارے اور معاویہ کے درمیان مسئلہ خلافت اختلاف کا باعث ہے۔ ہم دونوں میں سے اس کا حق دار کون ہے، میں یا معاویہ؟ دونوں حالتوں میں اُمتِ محمدیہ کی اصلاح اور مسلمانوں کو خونریزی سے بچانے کے لئے میں اس

سے دست بردار ہوتا ہوں"

اس تاریخی اعلان کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ مسندِ خلافت سے کنارہ کش ہو گئے اور امیر معاویہ بلا شرکتِ غیرے سارے عالم اسلام کے فرماں روا بن گئے۔ یہ واقعہ ربیع الاوّل سنہ ۴۱ھ میں پیش آیا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ زبردست قوت کے مالک تھے

کیونکہ جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے تاریخ اس کا ساتھ دینے سے انکار کرتی ہے۔ اس لئے کہ جس وقت حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ مدائن کی طرف تشریف لے گئے ہیں اس وقت آپ شام اور مصر کے سوائے تمام عالمِ اسلام کے حکمران تھے۔ حجاز خصوصاً یمن میں آپ کے جاں نثاروں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ فارس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شیدائی زیادہ موجود تھے جو ایران اور اس کے تمام ملحقہ علاقوں کے گورنر اور عرب کے چار مدبروں اور شجاع لوگوں میں سے ایک تھے اور آخر وقت تک حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے وفادار رہے۔ بلکہ حضرت امام حسن کی دست برداری کے بعد بھی عرصہ تک انہوں نے معاویہ کی بادشاہت کو تسلیم نہیں کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خارجی بھی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو گئے تھے۔ کیونکہ انہیں حضرت امام حسن سے کوئی عناد نہ تھا، اس لئے وہ سب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے پرچم تلے جمع ہو گئے تاکہ انہیں اپنے پرانے دشمن اور خلافت کے باغی (امیر معاویہ) سے انتقام لینے کا موقع مل سکے۔ یہ بڑے بہادر لوگ تھے اور ان کے سرفروشانہ کارناموں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ اس کے علاوہ ابن عساکر کے بقول چالیس ہزار بہادروں کا لشکر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے پرچم تلے جمع تھا، جو امیر معاویہ سے جنگ کرنے اور مارنے مرنے کی قسم کھا چکا تھا۔

ان واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی فوج آپ کی جاں نثار اور فداکار تھی اور آپ زبردست قوت کے مالک تھے۔

ایک اور شہادت

ایک موقع پر جب آپ کے متعلق مشہور کیا گیا کہ آپ دوبارہ حصولِ خلافت کی کوشش کر رہے ہیں اور ایک شخص نے اس بارے میں آپ سے دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا

کہ : ”جس وقت تمام اہلِ عرب کے سر میری مٹھی میں تھے اور میں انہیں جس سے لڑانا چاہتا وہ اس سے لڑ جاتے اور جس سے صلح کرنا چاہتا وہ میرے ساتھ ہو کر اس سے صلح کر لیتے۔ جب میں نے اس وقت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اُمّتِ محمدیہ کو تفرقہ و خونریزی سے بچانے کے لئے خلافت کو چھوڑ دیا تو اب میں اس کے حصول کے لئے کیا کوشش کروں گا۔“

•

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے اس جواب سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی حکومت و خلافت پوری طرح قائم ہو چکی تھی اور لوگ آپ کا بڑا ادب و احترام اور دل و جاں سے آپ کے احکام کی تعمیل کرتے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے خلافت چھوڑ دی۔ اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ آپ کو خونریزی سے طبعًا نفرت تھی۔ ذیل کے واقعات سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے مزاج ہی ایسا پایا تھا جو خونریزی پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا۔

•

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے مزاج کا تجزیہ

۱۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر باغیوں اور مفسدوں نے حملہ کیا اور مدینہ کے حالات خراب ہونے لگے تو آپ کی فراست نے محسوس کر لیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان معاملات سے غیر متعلق نہیں رہ سکیں گے، اور اگر ان کی موجودگی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے تو بنی امیہ ان کا دامن بھی خونِ عثمان میں ملوث کر دیں گے۔ جس کے نتیجے میں سخت خونریزی ہوگی۔

چنانچہ اسی لئے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ آپ کچھ عرصہ کے لئے مدینہ سے باہر چلے جائیے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک ایسی حالت میں کہ اہلِ مدینہ اور خلیفۃ المسلمین سخت مصیبت میں گھرے ہوئے تھے انہیں چھوڑ کر چلا جانا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ اور یہ بے وفائی کے مترادف تھا۔ اس لئے انہوں نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا مگر اس سے یہ تو ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ خوں ریزی سے کس قدر نفرت کرتے تھے۔

۲۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب حضرت

علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی جانے لگی تو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے پھر انہیں مشورہ دیا کہ جب تک سارا عالم اسلام آپ سے بیعت لینے کی درخواست نہ کرے، اس وقت تک آپ بیعت نہ لیں تاکہ بعد میں کوئی فتنہ نہ اُٹھ کھڑا ہو اور اُمت کو قتل و غارت کا شکار نہ ہونا پڑے۔

لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا یہ مشورہ بھی قبول نہیں کیا۔ کیوں کہ اس وقت حالات بڑے ناگفتہ بہ تھے۔ مدینہ پر باغیوں اور فسادیوں کا قبضہ تھا۔ اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہی مناسب سمجھا کہ بیعت لینے کے بعد حالات کو درست کیا جائے اور قیام امن کے لئے جدوجہد کی جائے۔ اس لئے آپ نے بیعت قبول کر لی۔

بہر حال حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے اس مشورے سے تو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ فتنہ و فساد اور قتل و غارت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

۲۔ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا خونِ عثمان کا قصاص لینے کے لئے مکّہ سے بصرہ کی طرف روانہ ہوئیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اس واقعہ کی اطلاع مل گئی تو آپ بھی ایک لشکر جرار لے کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو روکنے

کے لئے روانہ ہونے لگے۔ اس موقع پر پھر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت علی کو مشورہ دیا کہ آپ مدینہ ہی میں رہیئے اور حالات کا رُخ دیکھتے رہیئے۔ جب معاملات آپ کے حق میں درست ہو جائیں تو پھر کہیں جائیے۔

لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا یہ مشورہ بھی تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ خلیفۃ المسلمین اور اسٹیٹ کے سربراہِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے آپ کے نازک فرائض آپ سے مطالبہ کر رہے تھے کہ جب آپ کی حدودِ مملکت پر حملہ کیا جائے تو آپ حملہ آوروں کو شکست دینے اور اپنی مملکت کے عوام کی جان و مال کی حفاظت کے لئے فوراً موقع پر پہنچیں۔ چنانچہ آپ نے یہی کیا اور یہی کرنا چاہیئے تھا لیکن حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا مشورہ تو یہی تھا کہ قتل وخوں ریزی سے اجتناب کیا جائے اور آپ کے اس مشورے سے بھی آپ کی فطری امن پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔

۴۔ پھر جب آپ کوفہ کی جامع مسجد میں خلافت کی بیعت لینے کے لئے تشریف لائے اور مشہور صحابی حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا کہ میں آپ سے بیعت کرتا ہوں۔ احکامِ الٰہی کی تعمیل، سُنّتِ رسول صلی اللہ

علیہ وسلم کی پیروی اور مفسدین سے جنگ کرنے پر (حضرت قیس کا اشارہ اہلِ شام کی طرف تھا)۔ تو اس کے جواب میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ احکامِ الٰہی اور سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کافی ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا ارادہ شروع ہی سے جنگ کرنے کا نہ تھا۔

۵۔ آپ نے انتقال سے پہلے وصیت کی کہ مجھے جوارِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں دفن کیا جائے لیکن اگر بنو اُمیہ مزاحمت کریں تو پھر اس پر اصرار نہ کیا جائے بلکہ جنت البقیع میں سپردِ خاک کر دیا جائے۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی اس وصیت سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ اپنی فطرت اور مزاج کے لحاظ سے صلح پسند تھے اور اپنے مفاد اپنی ذات اور اپنے وقار کے لئے مسلمانوں میں خوں ریزی کو پسند نہیں کرتے تھے۔

ان تصریحات کے بعد وہ تمام روایات باطل ہو جاتی ہیں جن میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس قسم کی باتیں منسوب کی گئی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی فوج میں انتشار وافتراق تھا اور اسی بناء پر آپ نے اقتدار امیر معاویہ

کے حوالے کر دیا۔

ہاں اس میں شک نہیں کہ جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ امیر معاویہ کے مقابلے کے لئے روانہ ہوئے اور مدائن کے قریب پہنچ کر آپ نے وہ تقریر کی جس میں امیر معاویہ سے صلح کرنے کا اشارہ پایا جاتا تھا تو خارجی لوگوں کو جو امیر معاویہ کے سخت دشمن تھے یہ بات نہایت ناگوار گزری اور انہوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس احتجاج نے فساد کی صورت پیدا کر دی۔

لیکن حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے جاں نثاروں نے فوراً تلواریں نیام سے باہر نکال کر خارجیوں کو مار بھگایا۔ انہیں میں سے ایک خارجی نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ پر نیزے کا وار کیا، جس سے آپ زخمی ہو گئے مگر چند روز علاج کے بعد صحت یاب ہو گئے۔

لیکن خارجیوں نے کسے معاف کیا اور کون ان کے ہاتھ سے بچا۔ کیا اس سے پہلے انہوں نے امیر معاویہ پر قاتلانہ حملہ کر کے انہیں شدید زخمی نہیں کر دیا تھا؟ کیا انہوں نے عمرو بن العاص پر حملہ کرنے کی سازش نہیں کی تھی اور کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے ہاتھ سے شہید نہیں ہوئے۔ ایک معمولی سے

واقعہ پر راویوں نے اس قدر حاشیہ آرائی کی کہ اس کی شکل ہی بدل گئی۔

اصل بات

واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ چالیس ہزار کا لشکر جرّار لے کر مدائن کی طرف روانہ ہوئے اور امیر معاویہ شام سے پچیس، سے تیس ہزار کا لشکر لے کر نکلے تو حضرت امام حسن کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر پھر گیا جب اس سے پہلے خانہ جنگیوں میں ہزاروں مسلمان خاک وخون میں لوٹ لوٹ کر جاں بحق ہو گئے تھے۔ بے شمار بچّے یتیم اور ہزاروں عورتیں بیوہ ہو گئی تھیں۔ رومی امیر معاویہ کی سرحد پر حملہ کرنے کے لئے تیار کھڑے تھے اور ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدود سلطنت میں بعض غیر مسلم سردار بغاوت پر آمادہ تھے۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ جو پہلے ہی جنگ وجدل کے خلاف تھے اپنی اور امیر معاویہ کی فوجوں کی تیاریاں دیکھ کر سوچنے لگے کہ اگر پھر تلواریں بے نیام ہوئیں تو ایک بار تاریخ اپنے آپ کو پھر دہرائے گی اور پھر بے شمار مسلمانوں کی گردنیں

کٹیں گی۔

پس مسلمانوں کی اس خوں ریزی اور اُمتِ محمدیہ کی تباہی و بربادی کے اندیشہ سے آپ خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ ہمارے اس خیال کی تائید حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے اہلِ مدینہ کے ایک گروہ سے کہے تھے۔

تاریخ میں آتا ہے کہ خلافت سے دست بردار ہونے کے بعد جب آپ مدینہ پہنچے تو لوگوں نے امیرِ معاویہ سے صلح کرنے پر آپ کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ:۔

"مجھے یہ امر پسند نہیں آیا کہ میں اپنے رب سے اس حالت میں ملاقات کروں کہ ستر ہزار یا اس سے کچھ زیادہ افراد کے گلے سے خون بہہ رہا ہو اور ان میں سے ہر اک شخص یہ کہہ رہا ہو کہ خدایا! مجھے کس جُرم کی پاداش میں قتل کیا گیا ہے۔"

•

یہ تو حضرتِ امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دست برداری کا وہ بڑا سبب ہے جس کی تاریخی روایات سے نشاندہی

ہوتی ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور سبب بھی ہے جس کی طرف مؤرخین کی نظر نہیں جاتی۔ اور وہ یہ کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ خاندانِ بنو ہاشم کے زیرک ترین فرد تھے۔ وہ اپنی خداداد فراست سے اندازہ کر چکے تھے کہ انہیں جس قوم کا امیر بنایا گیا ہے اس کا دینی مزاج بگڑ چکا ہے۔ اس میں دنیا کی طرف رغبت پیدا ہو چکی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قوم میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو رضائے الٰہی کو ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے۔ مگر اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی جنہیں سونے چاندی کی جھنکار بہت محبوب تھی۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ یہ جھنکار انہیں نہیں سُنا سکتے تھے۔ قوم اپنا دینی معیار اس قدر بلند نہیں کر سکتی تھی جو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے پیشِ نظر تھا۔ اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ معیار اتنا پست نہیں کر سکتے تھے، جو قوم کے معیار کے ہم سطح ہو جاتا۔

آپ نے محسوس کر لیا تھا کہ قوم جن چیزوں کی طالب ہے وہ میں اسے نہیں دے سکوں گا۔ ممکن ہے آپ اصلاحِ احوال کی کوشش کرتے۔ مگر جب امیر معاویہ نے آپ کی سرحدوں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تو حالات کی نزاکت کا

احساس کرتے ہوئے آپ نے یہی مناسب سمجھا کہ یہ بارِ گراں امیر معاویہ کے سپرد کر دیں۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اس مرحلے پر ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ کے ساتھ جو مصالحانہ طرزِ عمل اختیار کیا وہ آپ کے والدِ گرامی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس طریقہ کار کے بالکل برعکس تھا جو انہوں نے امیر معاویہ کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی قیمت پر خلافت سے دست برداری گوارا نہ کی بلکہ امیر معاویہ کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنانے کے لئے ایسی جنگ لڑی جس میں ہزاروں مسلمان اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور وہ آخر دم تک امیر معاویہ کو مغلوب کرنے میں کوشاں رہے۔

مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اوّل دن ہی سے مصالحانہ روّیہ اختیار کر لیا اور آخر کار انہوں نے اقتدار معاویہ کے سپرد کر دیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں میں سے کس کی روش صحیح تھی؟ باپ کی یا بیٹے کی؟ پھر اس اعتراض سے دوسرا اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ

سے صلح کر کے ان کی بیعت کی تو پھر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے یزید سے کیوں جنگ کی؟ انہوں نے بھی اپنے برادر بزرگ کے نقشِ قدم پر چل کر حاکمِ وقت کی بیعت کیوں نہ کرلی۔

ہمارے خیال میں یہ دونوں اعتراض کم فہمی کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں۔ جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے ہمیں وہ حالات پیشِ نظر رکھنا چاہئیں جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ کے خلاف یہ سخت ترین قدم اٹھایا تھا۔ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مظلومانہ شہید کیا گیا، اس وقت اُمّتِ مسلمہ کی حالت اس کنبہ کی سی تھی جو اپنے سربراہ کی وفات کے بعد یتیم اور بے سہارا ہو جاتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ایک طرف تو مسلمان بغیر کسی امیر کے زندگی گزار رہے تھے اور دوسری طرف اسلامی اسٹیٹ کے مرکز (مدینہ) پر فسادیوں کا تسلّط تھا۔ ہر طرف انتشار برپا تھا اور اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کے اس باہمی افتراق سے فائدہ اٹھا کر کوئی غیر مسلم طاقت سلطنتِ اسلامیہ پر حملہ نہ کر دے۔ اس وقت اہلِ مدینہ کے نزدیک تین شخص خلافت کے اہل تھے، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت علی

رضی اللہ عنہم۔ پہلے دونوں بزرگ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے سے انکار کر چکے تھے۔

اب صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ باقی رہ گئے تھے۔ اگر وہ بھی یہ بارِ گراں اٹھانے سے معذوری ظاہر کر دیتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس اُمّت کا کیا حشر ہوتا۔ اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُمّت کی بھلائی کی خاطر خلافت قبول کر لی۔ خلافت قبول کرنے کے بعد یہ امر ان کے فرائض میں شامل ہو گیا تھا کہ وہ سلطنتِ اسلامیہ میں امن وامان قائم کریں اور جو شخص یا جماعت ان کی اطاعت سے روگردانی کرے اسے جس طرح ممکن ہو اپنا مطیع وفرماں بردار بنائیں۔

چنانچہ اس سے پہلے یہی معاملہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا تھا اور قبائل کے قبائل ان سے باغی ہو گئے تھے مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خوں ریزی کا خیال کئے بغیر ان کے خلاف تلوار اٹھائی اور مار مار کر اپنا مطیع وفرمانبردار بنا لیا۔ حالانکہ ان میں بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو اسلام پر بدستور قائم تھے۔ اور اپنی جہالت کی وجہ سے صرف زکوٰۃ کی معافی کے خواستگار تھے۔ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی قطعاً پرواہ نہیں کی کہ ان کی تلوار سے مسلمان کا

خون ہوتا ہے یا کافر کا۔ ان کے پیشِ نظر ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ جس طرح بھی ہو باغیوں کو خلیفۂ وقت کا فرماں بردار بنایا جائے، بعینہٖ یہی صورت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی۔

جب امیر معاویہ نے ان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خط و کتابت اور اپنے نمائندوں کے ذریعہ سے انہیں اپنا مطیع بنانے کی کوشش کی۔ مگر جب وہ کسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت پر آمادہ نہ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر کے مسلک پر چل کر ان سے جنگ کی۔ کیوں کہ خلیفۂ وقت کی حیثیت سے ان کا منصب یہی تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نقطہ نگاہ

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ایک موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ اے عثمان! اللہ تعالیٰ تمہیں ایک قمیض پہنائے گا۔ پھر لوگ تم سے مطالبہ کریں گے کہ یہ قمیض اُتار دو، مگر تم نہ اُتارنا۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مُراد

یہ تھی کہ تم خلیفہ بنائے جاؤ گے۔ پھر ایک وقت ایسا آئے گا، جب لوگ تم سے قبائے خلافت اُتارنے کا مطالبہ کریں گے۔ اور تمہیں معزول کرنے کی کوشش کریں گے مگر تم معزولی گوارا نہ کرنا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے یہ استدلال کرتے تھے کہ خلیفہ اللہ تعالیٰ بناتا ہے گو ظاہری طور پر اس کا انتخاب بندے کرتے ہیں مگر اس میں تصرفِ الٰہی کام کر رہا ہوتا ہے۔ اس لئے جب کسی شخص کو خلیفہ بنایا جائے تو اسے معزول نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جنگِ صفین کے بعد ان ثالثوں کا فیصلہ رد کر دیا جنہوں نے آپ کو خلافت سے معزول کرنا چاہا تھا۔ کیوں کہ یہ فیصلہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاء کے بالکل خلاف تھا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا نقطہ نگاہ

لیکن حضرتِ امام حسن رضی اللہ عنہ کا نقطۂ نگاہ ان سے مختلف تھا۔ ان کے پیشِ نظر صرف یہ امر تھا کہ مسلمانوں میں خوں ریزی نہ ہو۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ امیر معاویہ پوری طرح طاقت پکڑ چکے ہیں۔ اور اب وہ کسی

قیمت پر اقتدار سے دست بردار نہیں ہوں گے۔ انہیں اقتدار سے دست بردار کرنے کے لئے شدید ترین جنگ کرنی پڑے گی جس میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہہ جائے گا اور جیسا کہ اس سے پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ خوں ریزی ان کے مزاج اور فطرت کے خلاف تھی۔ اس لئے انہوں نے خلافت سے دستبرداری گوارا کر لی۔

یہ نقطہ نگاہ کا اختلاف ہے، ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا اس میں وہ اپنی جگہ مخلص اور دیانت دار تھے اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا وہ بھی اخلاص اور دیانت داری کی بناء پر تھا۔ ذاتی فائدہ نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیشِ نظر تھا اور نہ حضرت امام حسن کے پیشِ نظر تھا۔ دونوں اُمّت کی اصلاح چاہتے تھے۔ ایک نے اصلاح تلوار سے کی اور دوسرے نے خلافت سے دست بردار ہو کر۔

صحیح نقطۂ نگاہ

لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اصولی لحاظ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کا نقطہ نگاہ درست تھا۔ کیوں کہ اس کے حق میں بڑے وزنی دلائل موجود ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت ہوئی اور انہوں نے ہزاروں آدمیوں کا خون بہا کر اس بغاوت کو ختم کر دیا مگر خلافت کے تقدس پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتنہ و فساد اور بغاوت رونما ہوئی اور ان سے معزولی کا مطالبہ کیا گیا، مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جان دینی گوارا کر لی لیکن خلافت دینی گوارا نہ کی۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ان کے خلاف کئی بغاوتیں ہوئیں انہوں نے ہر بغاوت کو ختم کر دیا اور اس میں بھی ہزاروں مسلمانوں کا خون بہہ گیا مگر انہوں نے خلافت سے دستبرداری قبول نہ کی حتیٰ کہ اپنی جان دے دی۔ لیکن جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے دست برداری کا مطالبہ کیا گیا تو انہوں نے یہ دست برداری قبول کر لی۔ صرف اس لئے کہ مسلمانوں میں خونریزی نہ ہو۔

دوسرے اس لئے جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ آپ محسوس فرما چکے تھے کہ مسلمانوں میں وہ دینی جذبہ ختم ہو چکا ہے۔ جو عہدِ رسالت کا طرۂ امتیاز تھا اور اب ہر شخص ذاتی مفاد کو عزیز رکھتا ہے۔ آپ نے اندازہ کر لیا تھا کہ قوم آپ کے ساتھ اس راستے

پر نہیں چل سکتی جس پر آپ اسے لے جانا چاہتے تھے، اس لئے آپ اس شخص کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے جو ان دنیاداروں کے مطالبے پورے کر سکتا تھا۔

بہر حال یہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا ذاتی خیال اور اجتہاد تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت عارضی طور پر تو یہ خون ریزی بند ہو گئی لیکن اس کے بعد اسی مسئلے پر جو شدید خون ریزی شروع ہوئی تو صدیوں تک جاری رہی اور ہزاروں نہیں لاکھوں جانیں ضائع ہو گئیں۔

دوسرا اعتراض

جہاں تک دوسرے اعتراض کا تعلق ہے کہ جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ سے مصالحت کر لی تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کی مخالفت کیوں کی۔ یہ اعتراز کرنے والے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ امیر معاویہ اور یزید میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ایک مخصوص طبقے کو چھوڑ کر مسلمانوں کا وہ طبقہ جو تاریخ سے پوری طرح باخبر ہے۔ امیر معاویہ کے اخلاق پر حرف گیری نہیں کر سکتا۔

ان کی تین غلطیوں سے قطع نظر جن سے یقیناً اُمّت کو

بڑا نقصان پہنچا، وہ خوش خلق، فیاض، عالی ظرف اور عبادت گزار حکمران تھے۔ فسق و فجور سے انہیں سخت نفرت تھی۔ شراب اور زنا کے وہ قریب بھی نہیں جاتے تھے۔ نہ انہیں رقص و سرود سے کوئی شغف تھا۔ غرض ان میں کوئی اخلاقی خامی نہ تھی جس سے اُمّت کے دین اور اخلاقی مزاج بگڑنے کا خطرہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے انہیں اقتدار تفویض کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

لیکن اگر امیر معاویہ فاسق و فاجر اور بدکردار حکمران ہوتے تو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی عنانِ حکومت کبھی ان کے حوالے نہ کرتے۔ لیکن یزید کا معاملہ امیر معاویہ کے بالکل برعکس تھا۔ وہ پرلے درجے کا بدکردار، عیاش، فاسق و فاجر اور اوباش قسم کا آدمی تھا۔ جس کے ہاتھ میں ہاتھ دینا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جیسے متقی اور پرہیزگار انسان کے شایانِ شان نہ تھا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات

خلافت سے دستبرداری کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اپنے اہلِ و عیال اور اہل بیت کو لے کر مدینہ چلے گئے۔ اور زندگی کے باقی ایام وہیں گزار کر ربیع الاوّل ۴۹ھ میں

انتقال فرما گئے۔

انتقال سے کچھ عرصے پہلے آپ نے ایک خواب دیکھا کہ انکی دونوں آنکھوں کے درمیان قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۝ لکھا ہوا ہے۔ اہلِ بیت کو یہ خواب سُن کر بڑی مسرت ہوئی اور انہوں نے اسے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے لئے ایک نیک فال قرار دیا۔ مگر جب یہ خواب حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کو سنایا تو انہوں نے کہا کہ امام حسن رضی اللہ عنہ کا یہ خواب اگر سچا ہے تو ان کی عمر بہت کم رہ گئی ہے۔ وہی ہوا۔ اور اس کے چند روز بعد آپ وفات پا گئے۔

اپنی وفات سے قبل آپ نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں یہ پیغام دے کر بھیجا کہ مجھے جوارِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم میں دفن ہونے کی بڑی آرزو ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو مجھے دفن کر دیا جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بلا پس و پیش اجازت دے دی۔ جب آپ پر نزع کا عالم طاری ہونے والا تھا تو اس سے کچھ دیر پہلے آپ نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو تاکید فرمائی کہ میری وفات کے بعد تم پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے پاس جانا اور دوبارہ اجازت لے لینا۔ ممکن ہے انہوں نے

نے میری مروت کی وجہ سے اس وقت اجازت دے دی ہو، اور میرے انتقال کے بعد لوگوں کے کہنے کی وجہ سے تردد پیدا ہو جائے۔ مجھے اس امر کا بھی خطرہ ہے کہ بنو اُمیّہ میرا روضۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں دفن ہونا گوارا نہیں کریں گے۔ اگر ایسی صورت پیش آئے، اور دیکھو کہ فساد کا اندیشہ ہے تو پھر مجھے بقیع کے قبرستان میں دفن کر دینا۔

وہی ہوا جس کا حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو اندیشہ تھا۔ مروان بنو اُمیّہ کی ایک جماعت کو لے کر آ گیا اور اس نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو روضۂ رسولِ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں دفن کرنے کی بڑی شدت سے مخالفت کی۔

ایک روایت کے مطابق اس نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عثمان (رضی اللہ عنہ) تو بقیع کے قبرستان میں دفن ہوں اور حضرت حسن (رضی اللہ عنہ) روضۂ رسول میں دفن کئے جائیں، جب فساد اور ہنگامے کی صورت پیدا ہونے لگی تو حضرت امام حسین رضی اللہ، حضرت عبداللہ بن جعفر اور بنو ہاشم کے دوسرے اکابر کے مشورے اور حضرت امام حسن کی وصیت کے مطابق آپ کو بقیع کے قبرستان میں حضرت فاطمۃ الزہرا کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ آپ کے جنازے کی نماز حاکم مدینہ سعید بن العاص

نے پڑھائی۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر سنتے ہی مدینہ میں ایک حشر سا برپا ہو گیا۔ ہر طرف صفِ ماتم بچھ گئی۔ دکانیں بند ہو گئیں۔ راستوں اور گلیوں میں ویرانی کا سا عالم چھا گیا۔ خصوصاً بنو ہاشم کی عورتوں نے کتنے ہی دن سوگ منایا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ کی کیفیت تو ناقابلِ بیان تھی۔ مسجد نبوی کے در و دیوار اُن کی آہ وزاری سے گونج رہے تھے۔ خود بھی روتے جاتے تھے اور لوگوں سے بھی چیخ چیخ کر کہتے تھے کہ: "اے لوگو!

خوب رو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب سے دنیا خالی ہو گئی۔"

آپ کا جنازہ اس شان سے اٹھا کہ اس کی نظیر بہت کم دیکھنے میں آئی ہو گی۔ ثعلبہ بن ابی مالک جو آپ کے جنازے میں شریک تھے بیان کرتے ہیں کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے جنازے میں لوگوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ اگر سوئی جیسی باریک چیز بھی پھینک دی جاتی تو اژدھام کی وجہ سے زمین پر نہ گرتی۔

سِیرت

و

کِردار

سیرت و کردار

سیدنا حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اس بزرگ اور عظیم تر خانوادے کے چشم و چراغ تھے، کہ فضل و کمال جس کے گھر کا پروردہ حکمت و دانش جس کے گھر کی کنیز، عفو و کرم اور حلم و بردباری جس کے گھر کی لونڈی اور فیاضی جس کے گھر کی باندی تھی۔ ان خاندانی اوصاف و کمالات سے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو بھی بڑا حصہ ملا تھا۔

حِلم و بُردباری

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ان کمالات میں ضبط و تحمل اور بُردباری کو ایک خاص امتیازی مقام حاصل ہے۔ جب سے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ سے صلح کر کے خلافت سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اس وقت سے خوارج آپ کے شدید دشمن ہو گئے تھے۔ کیوں کہ وہ اپنے مذہبی عقائد کی بنا پر امیر معاویہ کو کافر اور غاصبِ خلافت کہتے تھے، اور ان

کے ساتھ صلح کرنے والے کو بھی اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب تک حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ سے صلح نہیں کی تھی وہ ان کے جاں نثار اور مطیع و فرماں بردار تھے۔ مگر جب انہوں نے مصالحت کر لی تو ان کے متعلق بھی نہایت تیز و تند اور توہین آمیز کلمات استعمال کرنے لگے۔

ان میں سے بعض خوارج حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی آپ کے ساتھ گستاخی سے پیش آتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ان میں سے ایک شخص نے آپ کو "مذل المومنین" یعنی اے مسلمانوں کو ذلیل کرنے والے، کے الفاظ سے مخاطب کیا۔ مگر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اس سخت اور تحقیر آمیز فقرے کو سن کر کمال تحمل و بردباری سے جواب دیا کہ تم نے جیسا مجھے کہا ہے میں ہرگز ویسا نہیں ہوں۔ میں نے حکومت کی طمع میں پڑ کر مسلمانوں کو خوں ریزی میں مبتلا کرنا پسند نہیں کیا۔ یہ کافی و شافی جواب سن کر خارجی خاموش ہو گیا۔

بنو امیہ میں مروان بڑا بد باطن اور منہ پھٹ شخص گزرا ہے۔ یہ اہل بیت خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بڑا دشمن تھا اور سر منبر آپ کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ بعض دفعہ مسجد نبوی میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہوتے اور مروان آپ کی موجودگی

میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نازیبا کلمات سے یاد کرتا۔ مگر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ ہمیشہ خاموشی اختیار کر لیتے۔ حالانکہ اس گئے گزرے زمانہ میں بھی آپ کے عقیدت مندوں اور خصوصاً بنو ہاشم کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ یہ لوگ بڑے بہادر اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے جاں نثار تھے۔ اگر امام موصوف چاہتے تو ادنیٰ اشارے سے اس قسم کے لوگوں کی گستاخیوں کا مزا چکھا سکتے تھے مگر آپ نے ہمیشہ درگزر سے کام لیا۔

ایک بار اسی مروان نے ایک شخص کے ذریعہ چند فحش اور گستاخانہ باتیں آپ کو کہلا بھیجیں۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے یہ تکلیف دہ کلمات سُن کر اتنا کہا کہ مروان سے کہہ دینا کہ "بخدا میں تمہیں گالیاں دے کر تمہارے دامن پر سے گالیاں دینے کا داغ مٹانا نہیں چاہتا۔ ایک روز ایسا بھی آنے والا ہے جب ہم دونوں خدا تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوں گے۔ اگر تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے تو اللہ تعالیٰ تمہاری صدق گوئی کا اجر تمہیں دے گا اور اگر تم نے جھوٹ بولا ہے تو پھر وہ منتقم حقیقی ہے۔"

تاریخ میں ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ ایک بار سخت بیمار ہو گئے۔ اطباء نے آپ کو تبدیل آب و ہوا کا مشورہ

دیا۔ چنانچہ آپ اس مقصد کے لئے موصل تشریف لے گئے۔ اس سفر میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ جب موصل میں آپ کی تشریف آوری کی خبر مشہور ہوئی تو لوگ جوق در جوق آپ کی زیارت اور ملاقات کے لئے آنے لگے۔ انہی لوگوں میں نواحِ موصل کا ایک شخص تھا جو غالباً خارجی عقیدہ رکھتا تھا۔ صحت یاب ہونے کے بعد جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے اصرار پر نماز پڑھائی اور درس دینا شروع کیا تو نواحِ موصل کا یہ خارجی بھی آپ کے درس میں شریک ہونے لگا۔ ایک روز موقع دیکھ کر اس نے اپنے نیزے کا پھل آپ کے پیر میں چبھو دیا۔ پیر سے خون جاری ہو گیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اسے پکڑ لیا۔ مگر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو۔ فوراً جراح کو بلایا گیا۔ اس نے زخم دیکھ کر کہا کہ جس نیزے سے زخم لگایا گیا ہے اس کا پھل زہر میں بجھا ہوا ہے۔ یہ سن کر لوگوں نے زخم لگانے والے کو پھر گرفتار کر لیا اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مگر عفو و کرم کے اس پیکرِ عظیم نے حکم دیا کہ اسے چھوڑ دو۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص

شام سے مدینہ آیا اور بیان کیا کہ ایک نازک اندام شخص عربی گھوڑے پر چلا جاتا تھا۔ میں نے اپنی عمر بھر میں ایسا خوبصورت سوار کوئی نہ دیکھا تھا۔ اس کے گھوڑے کی ٹاپیں میری روح کو پامال کرتی چلی جاتی تھیں۔ جب میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ حسن بن علی (رضی اللہ عنہ) ہے۔ مجھے ان دونوں کا نام سنتے ہی غصہ آیا اور حسد کے شعلے نے مجھے پیروں سے سر تک جلا کر خاکستر کر دیا کہ علی رضی اللہ عنہ کا فرزند ایسا ہو گیا۔

میں وہاں سے لپکا اور راہ میں ان کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر کہا کہ اے سوار تو علی (رضی اللہ عنہ) کا بیٹا ہے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا ہاں۔ سو میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بہت ہی بری باتیں سنائیں۔ مگر واہ رے تحمل۔ جب تک میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا کہتا رہا آپ چپکے کھڑے سنا کئے۔ جب میں کلام پورا کر چکا تو آپ نے ہنس کر فرمایا۔ شاید تو مسافر ہے اور شام سے چلا آتا ہے۔ میں نے کہا ہاں! فرمایا میرے ساتھ گھر چل تا کہ تیری مہمان نوازی میں مشغول رہوں اور اگر تیری کوئی حاجت ہو تو اسے پورا کر دوں۔ یہ سن کر میں نہایت شرمندہ ہوا اور ان کے مکارم اخلاق اور حسنِ عادات

سے بے حد متعجب ہوا۔ اس کلام نے میرے دل کو ایسا موہ لیا کہ میں ضبط نہ کر سکا اور بے اختیار آپ کے حلقۂ اطاعت میں شامل ہو گیا۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے اس عدیم المثال صبر و تحمل کا مروان جیسا ظالم اور سنگ دل شخص بھی معترف تھا چنانچہ جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا اور آپ کا جنازہ قبرستان کی طرف لے جایا جانے لگا تو مروان بھی ساتھ تھا۔ وہ آپ کے جنازے پر دھاڑیں مار مار کر روتا تھا۔ حضرت امام حسین اُسے روتا دیکھ کر کہنے لگے کہ اب تم روتے ہو لیکن جب وہ زندہ تھے تو تم ان کے ساتھ کیا کیا نہ کرتے تھے۔ یہ سُن کر مروان نے پہاڑ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں جو کچھ کرتا تھا وہ اس شخص کے ساتھ کرتا تھا جس کا حلم و بردباری اس (پہاڑ) سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔

اس قسم کے واقعات کو دیکھ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تصدیق کرنی پڑتی ہے کہ "حسن (رضی اللہ عنہ) کو میرا حلم اور میری صورت ملی ہے۔"

سخاوت

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی کتاب فضائل کا دوسرا باب آپ کی داد و دہش ہے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ فطرتاً نہایت سخی، فراخ دل اور کشادہ دست واقع ہوئے تھے۔ طبیعت ایسی پائی تھی جو دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر سخت تکلیف محسوس کرتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے مال وزر کی نعمت سے نوازا تھا۔ پانچ ہزار ماہانہ وظیفہ باقاعدگی سے آپ کو وہ ملتا تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ذاتی جائیداد کی آمدنی کئی ہزار درہم تھی۔ پھر ایک لاکھ درہم سالانہ امیر معاویہ کی طرف سے ملتے تھے۔ اس کثیر دولت کا زیادہ حصہ آپ خیرات وصدقات اور مصیبت زدہ افراد کی امداد پر خرچ کردیا کرتے تھے۔ چنانچہ ابن اثیر کا بیان ہے کہ زندگی میں تین مرتبہ آپ نے اپنی دولت کا نصف حصہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کردیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے تین بار آدھا مال اور دوبار سارا مال خدا کی راہ میں دے ڈالا۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا ابرِ سخاوت دوست و دشمن کے امتیاز کے بغیر سب پر برستا تھا۔ چنانچہ ایک روز ایک ایسا شخص مدینہ میں آیا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق نازیبا کلمات استعمال کیا کرتا تھا۔ اسے کسی دور دراز سفر پر جانا تھا مگر نہ زادِ راہ پاس تھا اور نہ سواری۔ چنانچہ وہ مختلف لوگوں کے پاس سائل کی حیثیت سے گیا مگر کہیں کامیابی نہ ہوئی۔ تب ایک شخص کے مشورے پر وہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی مشکل بیان کی۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اس کے لئے سواری بھی مہیا کر دی اور زادِ راہ کے طور پر کچھ رقم بھی دے دی۔

ایک بار حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ، حضرت امام حسین اور حضرت عبد اللہ بن جعفر (رضی اللہ عنہم) کسی سفر پر روانہ ہوئے راستہ میں سخت پیاس معلوم ہوئی۔ کچھ دور چل کر ایک جھونپڑی نظر آئی۔ یہ ایک ضعیفہ کا گھر تھا۔ چنانچہ تینوں حضرات اس کے گھر میں مہمان ہوئے۔ بڑھیا نے اپنے مہمانوں کی دودھ سے تواضع کی۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا کہ انہوں نے ضعیفہ سے پانی مانگا اور اس نے دودھ پیش کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ ضعیفہ کسی کام سے مدینہ آئی اتفاق

سے راستے میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ بھی مل گئے۔ آپ نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اپنے دولت کدہ پر لے گئے اور خاطر تواضع کرنے کے بعد کچھ دینار اور بکریاں اس کی نذر کیں۔ پھر اسے اپنے ہمراہ لے کر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے مکان پر تشریف لے گئے اور ان سے بھی کچھ دینار اور بکریاں ضعیفہ کو دلوائیں پھر اسے حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کے مکان پر لے گئے اور انہوں نے بھی ضعیفہ کو کچھ دینار اور بکریاں بطور تحفہ عنایت فرمائیں۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ جہاں ایک طرف بڑے فیاض اور دریا دل تھے وہاں دوسری طرف سخاوت کے معاملے میں بڑے محتاط بھی تھے اور ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ دولت کا غلط مصرف نہ ہو۔ اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھائیں جو مستحق ہیں۔

چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے فقراء و مساکین میں تقسیم کرنے کے لئے بہت سی رقم جمع کی اور پھر مدینہ میں اس کی تقسیم کا اعلانِ عام کر دیا۔ اس اعلان کو سُن کر لوگ آپ کے دروازے پر جمع ہو گئے جن میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جو اس تقسیم سے حصہ لینے کے مستحق نہ تھے۔ لوگوں کا اژدھام دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ رقم صرف فقراء اور مساکین کے لئے جمع کی ہے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا یہ اعلان سُن کر تقریباً نصف آدمی چلے گئے۔

عبادت و ریاضت

سیدنا حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی سیرت کا ایک روشن پہلو کثرتِ عبادت و ریاضت بھی ہے۔ نماز سے آپ کو خاص رغبت تھی اور یہ فرض بڑے خشوع و خضوع سے ادا فرماتے تھے۔ جن دنوں مکہ میں قیام ہوتا تھا ان دنوں عصر کی نماز کے بعد بلاناغہ کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ اور وہیں نماز پڑھتے تھے۔ ایک تختی پر سورۂ کہف لکھوائی تھی، سونے سے پہلے اس کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

حج کا فریضہ بھی آپ بڑے شغف سے ادا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق اپنے والد ماجد حضرت امام باقر سے روایت کرتے ہیں کہ باوجودیکہ آپ کے پاس کوتل گھوڑے ہوتے تھے، مگر مکہ سے مدینہ تک راستہ آپ پیدل طے کرتے تھے۔ آپ نے پندرہ پا پیادہ حج کئے۔

ایک روز امیر معاویہ نے ایک شخص سے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے مشاغل کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے بیان کیا کہ حضرت امام فجر کی نماز پڑھ کر طلوعِ آفتاب تک مصلّے پر بیٹھے وظائف و اوراد میں مشغول رہتے ہیں۔ اس کے بعد سہارے

سے بیٹھ جاتے ہیں اور ملاقاتوں سے ملتے ہیں۔ جب کچھ دن چڑھ جاتا ہے تو یہ چاشت کی نماز ادا کرتے ہیں۔ پھر امہات المومنین سے ملاقات کرنے جاتے ہیں۔ اس کے بعد گھر آتے ہیں اور کچھ دیر بعد (یعنی دوپہر کا کھانا کھا کر) پھر مسجد کو چلے جاتے ہیں۔

خدمتِ خلق

عبادت کے متعلق حضرت امام حسن رضی اللہ کا ایک خاص نظریہ تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ وہ عبادت نہیں ہو سکتی جو خدمتِ خلق سے روک دے۔ بلکہ آپ کے خیال میں جہاں عبادت کی معراج رضائے الٰہی کا حصول ہے وہاں اس کا کمال یہ بھی ہے کہ انسان خدمتِ خلق کا پیکر بن جائے۔

چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ کوئی شخص کسی ضرورت سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے پاس گیا۔ اس وقت آپ اعتکاف میں تھے۔ پس انہوں نے اس کی خدمت کرنے سے معذرت کر دی لیکن جب وہی شخص حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو باوجود یکہ آپ بھی اعتکاف میں تھے مگر آپ نے اس کا کوئی خیال نہ کیا اور اعتکاف سے نکل کر اس کی ضرورت پوری کر دی۔ بعض لوگوں نے اس پر

اعتراض کیا اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ آپ کے بھائی نے تو اعتکاف میں ہونے کی وجہ سے اس سے معذرت کر لی تھی مگر آپ اس کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اعتکاف سے باہر نکل آئے۔ تو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اپنے کسی بھائی کی اللہ کی راہ میں حاجت روائی کرنا میرے نزدیک مہینہ کے اعتکاف سے افضل ہے۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ خانۂ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ اسی دوران میں ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کسی ایسی فوری ضرورت کا اظہار کیا جس کے لئے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا ساتھ جانا ضروری تھا۔ آپ نے اسی وقت طواف چھوڑ دیا اور اس شخص کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اس کا کام کر کے پھر واپس آئے اور طواف مکمل کیا۔ اپنے اس اقدام کی توضیح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی کسی حاجت روائی کے لئے جاتا ہے اور اس کی وہ حاجت پوری ہو جاتی ہے تو ایسے شخص کو ایک حج اور ایک عمرہ کا ثواب دیا جاتا ہے۔ پس میں نے اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کر کے ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب بھی حاصل کر لیا اور پھر

واپس آکر اپنا طواف بھی مکمل کر لیا۔

حُسنِ خُلق

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ بے حد نرم طبیعت شیریں بیان اور حُسنِ اخلاق کا پیکر تھے۔ کبھی کوئی سخت کلمہ آپ کی زبان سے نہ سُنا گیا۔ اپنے دشمن کے ساتھ بھی شفقت و مہربانی سے پیش آتے تھے اور چہرۂ مُبارک پر ہر وقت تبسّم رہتا تھا۔

ابنِ سعد عمرو بن اسحٰق سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے سوائے کسی شخص نے ایسا کلام نہ کیا کہ وہ مجھے اتنا زیادہ بھلا معلوم ہو، جب کلام کرے اور خاموشی اختیار نہ کرے یعنی بجز حسن بن علی کے کوئی بولنے والا ایسا نہ تھا کہ جب وہ کلام کرتے تو حاضرین کا دل خاموش رہنے کو نہ چاہتا ہو۔ یہ بات حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہی کے کلام میں پائی جاتی تھی کہ دل چاہتا تھا کہ آپ کی تقریر سُنی جائے اور یہ کسی طرح خاموش نہ ہوں۔ کیوں کہ آپ کا کلام خود بخود دل کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔

ابنِ سعد نے اشعث بن سوار سے اور انہوں نے ایک اور شخص سے روایت کی کہ ایک شخص حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ

کی خدمت میں ایسے وقت حاضر ہوا جب آپ اُٹھ کر کسی کام سے جانے والے تھے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے بڑی خندہ پیشانی سے اسے مرحبا کہا اور فرمایا کہ آپ ایسے وقت تشریف لائے ہیں کہ ہم اُٹھ رہے ہیں، کیا آپ ہمیں جانے کی اجازت دیں گے؟

لوگوں کی عیب نکالنے کی حرکت سے آپ کو سخت نفرت تھی اور کبھی کسی کی بُرائی آپ کی زبان سے نہیں سُنی گئی۔ البتہ اگر کسی کو کوئی ایسا کام کرتے دیکھتے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہوتا یا کسی کو عبادت کے کسی رُکن کی ادائیگی میں غلطی کرتے دیکھتے تو اس طرح اصلاح فرماتے کہ غلطی کرنے والے کو اس امر کا احساس تک نہ ہوتا کہ آپ اس پر معترض ہیں۔

چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ آپ اپنے بھائی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ اثنائے راہ میں نماز کا وقت آگیا۔ اس لئے ایک مسجد میں گئے تاکہ وضو کر کے نماز ادا کریں۔ جب مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک شخص وضو کر رہا ہے۔ مگر اس کا طریق وضو مسنونہ آداب کے خلاف ہے۔ جب وہ شخص وضو کر چکا تو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہم دونوں وضو

کرتے ہیں، آپ ذرا دیکھتے رہیئے گا کہ مبادا ہم سے کوئی غلطی ہو۔ جائے اگر ہم وضو میں غلطی کرنے لگیں تو ہماری اصلاح کر دیجئے گا۔ یہ کہہ کر آپ نے وضو شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ جب وضو ختم کر لیا تو اس شخص کو معلوم ہو گیا کہ وضو کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے اور ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے کس سلیقے سے مجھے میری غلطی سے آگاہ فرمایا، چنانچہ اس نے آپ کا بے حد شکریہ ادا کیا۔

لباس و غذا

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ بڑے دولت مند شخص تھے اور آپ کی سالانہ آمدنی دو لاکھ درہم سے کم نہ تھی مگر اس کے باوجود آپ کی غذا بڑی سادہ تھی۔ یعنی جو کے بے چھنے آٹے کی روٹی معمولی سالن سے کھاتے اور پیٹ بھر جانے سے پہلے ہاتھ کھینچ لیتے تھے۔

بعض دفعہ ایک ہی وقت کھانا کھاتے۔ غذا کی طرح آپ کا لباس بھی سادہ ہوتا۔ نفیس اور قیمتی لباس سے آپ کو قطعاً رغبت نہ تھی۔ اکثر پیوند لگا ہوا موٹے کپڑے کا لباس زیب تن فرماتے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ قیمتی لباس استعمال

نہ کیا کرو اس سے تکبّر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن آپ کا لباس پیوند زدہ اور موٹے کپڑے کا ہونے کے باوجود ہمیشہ صاف اور مثل دُودھ کے سفید ہوتا تھا۔ گندگی سے آپ کو سخت نفرت تھی۔

رُشد و ہدایت

عبادت و ریاضت اور خدمتِ خلق کے بعد جو وقت بچتا اسے آپ درس و تدریس اور رشد و ہدایت کے لئے وقف فرما دیتے۔ آپ کا ایک حلقۂ درس تھا جس میں کثرت سے لوگ شامل ہوتے اور مختلف مسائل کے متعلق واقفیت حاصل کرتے۔

آپ قرآنِ کریم کی تفسیر اور احادیثِ نبوی کی توضیح و تشریح میں بڑے باریک نکتے بیان فرماتے۔ اور جو لوگ دینی مسائل کے متعلق سوالات کرتے ان کے کافی و شافی جواب دیتے۔ دین میں اضافہ کرنے والوں اور شخصیت کی پرستش کرنے والوں سے آپ کو سخت نفرت تھی اور ان لوگوں کی اصلاح کی طرف خاص توجہ دیتے۔

آپ کے والدِ گرامی کے زمانے ہی میں ایسے لوگوں کا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا مانتا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس طبقے کے لوگوں کو پہلے تو نرمی اور سختی دونوں طرح سے سمجھایا اور اس عقیدے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر جب وہ باز نہ آئے تو آپ نے انہیں بڑی عبرتناک سزائیں دیں۔

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض لوگوں نے اپنے عقائد سے توبہ نہ کی۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی اس قسم کے لوگوں کا ایک گروہ موجود تھا۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ عام لوگوں کی طرح فوت نہیں ہوئے ہیں بلکہ آسمان پر چلے گئے ہیں اور عنقریب ظاہر ہو جائیں گے۔ جب ان لوگوں کا یہ غلط عقیدہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو آپ نے بڑی سختی سے اس کی تردید کی اور فرمایا کہ خدا کی قسم یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ ایسے لوگ ہماری جماعت میں سے نہیں ہو سکتے۔

"اگر ہمیں بھی اس امر کا یقین ہوتا کہ آپ عنقریب ظاہر ہونے والے ہیں تو ہم نہ ان کا ترکہ تقسیم کرتے اور نہ ان کی بیویوں کو دوسرا نکاح کرنے دیتے۔"

•

علم و فضل

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے جس گھرانے میں پرورش پائی تھی وہ علم و فضل کا سرچشمہ تھا۔ گو آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں زیادہ عرصہ گزارنے کا موقع نہیں ملا۔ اور آپ کا سن مبارک آٹھ سال کا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بابرکت سایہ آپ کے سر سے اُٹھ گیا مگر اپنی ذہانت و تیز فہمی کی وجہ سے اس کم عمری میں بھی آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک سے اتنا استفادہ کیا جو عام لوگوں کے لئے اس عمر میں ممکن نہیں ہے۔ علم دین کی بہت سی باتیں آپ نے حضور سے سیکھیں اور انہیں یاد رکھا۔

آپ ایسی متعدد احادیث کے حافظ تھے جو آپ نے براہِ راست آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی تھیں۔ ان احادیث کو متعدد راویوں نے روایت کیا ہے۔ لیکن آپ کی ایسی حدیثوں کی تعداد تیرہ ہے جنہیں محدّثین نے صحت کا درجہ دیا ہے۔ دُعائے قنوت جو ساری دُنیا کے مُسلمان نمازِ عشاء کے آخری وِتر میں پڑھتے ہیں اس کی روایت حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہی نے براہِ راست آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے۔

بہت سی احادیث ایسی ہیں جو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہیں۔ جن لوگوں نے آپ سے سُن کر احادیث روایت کی ہیں' اُن میں اُمّت کے بڑے جیّد علماء اور بعض صحابہ بھی شامل ہیں۔ جیسے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حسن بن حسن، عبد اللہ، ابو جعفر، جبیر بن نصیر، عکرمہ، محمد بن سیرین اور سفیان بن لیل۔

جن علوم میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو خاص دست گاہ حاصل تھی ان میں علمِ قرآن، علمِ حدیث اور فقہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کے زمانے میں جو چیدہ چیدہ شخصیتیں فتوے جاری کیا کرتی تھیں ان میں آپ کا نام سرِ فہرست ہے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ فتوے دینے کے معاملے میں بہت محتاط تھے اور بڑے غور و فکر کے بعد فتویٰ صادر کیا کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ نے جو فتوے دیئے ان کی تعداد نسبتاً کم ہے۔

ایک بار لوگوں نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کہا کرتے ہیں کہ دولت مندی کے مقابلے میں فقر اور تندرستی کے مقابلے میں بیماری مجھے عزیز ہے۔

یہ سُن کر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ابوذر (رضی اللہ عنہ) پر رحم فرمائے، ان کا خیال نیک ہے مگر میرے نزدیک تو جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہو اسے اللہ تعالیٰ کی پسند کردہ حالت میں رہنے کے علاوہ کسی اور حالت میں رہنے کی آرزو ہی نہیں کرنا چاہیئے۔

ذہانت و نکتہ آفرینی

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ بڑے ذہین انسان تھے۔ طبیعت بڑی نکتہ آفریں پائی تھی۔ آپ کی رائے بڑی صائب ہوتی تھی اور مشورے بڑے دُور رس۔

علامہ ابنِ قیم جو اہلِ بیت کے متعلق روایات قبول کرنے کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی نکتہ آفرینی اور ذہانت کا ایک واقعہ درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ایک شخص کو اس حالت میں گرفتار کر کے آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ اس کے ہاتھ میں چھری تھی جس میں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اور پولیس نے اسے مقتول کی لاش

کے پاس کھڑے ہوئے گرفتار کیا تھا۔

جب اس کا مقدمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو۔ اس شخص نے عرض کیا کہ امیر المومنین میں قاتل ہوں اس لئے اس جرم کی سزا کا مستوجب ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اس کی گردن ماردی جائے۔ اتنے میں ایک شخص گرتا پڑتا امیر المومنین کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ یہ شخص بے گناہ ہے اصل قاتل میں ہوں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلے ملزم سے پوچھا کہ جب قاتل یہ ہے تو تم نے کیوں اقبالِ جُرم کیا۔ اس نے عرض کیا کہ امیر المومنین مجھے جس حالت میں گرفتار کیا گیا ہے وہ ایسی تھی کہ اگر میں اقبالِ جُرم نہ بھی کرتا تو بھی میرا بچنا محال تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ وہ کیا حالت تھی۔ اس نے بتایا کہ میں قصاب کا کام کرتا ہوں اور جس جگہ قتل کا یہ واقعہ پیش آیا اس کے قریب ہی میں نے بکرا ذبح کیا تھا۔ اسی اثنا میں مجھے پیشاب کی حاجت ہوئی۔ پیشاب کرنے کے بعد جب میں کھڑا ہوا تو مجھے ایک لاش نظر آئی میں اس کے قریب جا کر اسے دیکھنے لگا۔ اتنے میں پولیس آ گئی

چونکہ میں مقتول کے پاس کھڑا ہوا تھا اور میرے ہاتھ میں چھری تھی جس میں سے خون ٹپک رہا تھا، اس لئے مجھ پر قتل کا الزام رکھ دیا گیا۔ میں نے سمجھا کہ ان حالات میں اگر میں ارتکاب قتل سے انکار بھی کروں گا تو کوئی اس پر یقین نہیں کرے گا۔ اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ جُرم کا اقرار کر لوں۔

اس شخص کا بیان سُننے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوسرے ملزم سے پوچھا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اس نے عرض کیا کہ میں غریب اعرابی ہوں، میں نے مقتول کو مال و دولت کے لالچ میں قتل کر دیا۔ قتل کرنے کے بعد مجھے کسی کے پیروں کی آہٹ سُنائی دی۔ اُسے سُن کر اپنے آپ کو بچانے کے لئے میں ایک طرف چھُپ گیا۔ اس دوران میں پولیس نے آکر اس شخص کو گرفتار کر لیا۔ جس وقت آپ نے اس کی گردن مارنے کا فیصلہ سُنایا تو میں یہاں موجود تھا۔ فیصلہ سُن کر میں نے گوارا نہ کیا کہ ایک بے گناہ شخص کو قتل کیا جائے، اس لئے میں نے اقبالِ جرم کر لیا۔

دونوں کے بیانات سُن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا کہ اس مقدمے میں تمہاری کیا رائے ہے۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ امیر المومنین اس نے ایک شخص کی جان تو ضرور لی ہے مگر یہ بھی تو دیکھئے کہ اس نے سچائی سے کام لے کر ایک شخص کی جان بچائی بھی ہے۔ حضرت علی کو حضرت امام حسن (رضی اللہ عنہم) کا یہ مشورہ بہت پسند آیا اور انہوں نے آپ کی اصابت رائے کا اعتراف کرتے ہوئے دونوں کو رہا کر کے بیت المال سے مقتول کا خوں بہا ادا کر دیا۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے سب سے بڑے حریف امیر معاویہ کو بھی حضرت امام کے علم وفضل، آپ کی وسیع معلومات اور اصابت رائے کا اعتراف تھا۔ اور مشکل معاملات میں وقتاً فوقتاً ان سے رجوع کیا کرتے تھے۔

چنانچہ ایک بار انہوں نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ حکمران کی حیثیت سے ہم پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ حضرت امام نے فرمایا کہ جو فرائض حضرت سلیمان بن داؤد علیہم السلام نے متعین فرمائے ہیں۔

امیر معاویہ نے پوچھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کیا فرائض متعین کئے ہیں۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ

تم جانتے ہو کہ بادشاہ پر حکومت کی طرف سے کیا فرائض عائد ہوتے ہیں جن سے رعایا نقصان سے محفوظ رہے۔ پھر اُسے بتایا کہ :۔

"ظاہر بھی اور پوشیدہ بھی خدا سے ڈرتا رہے۔ خواہ غصہ کی حالت ہو یا خوشی کی، عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ ہر حال میں میانہ روی کو اختیار کئے رہے۔ کسی کے مال پر غاصبانہ قبضہ نہ کرے اور نہ کسی کے مال کو غلط جگہ پر صرف کرے۔ جس وقت تک وہ ان اصولوں پر عمل پیرا رہے گا وہ ہر نقصان سے محفوظ رہے گا۔"

خطابت

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اقلیم خطابت کے بادشاہ تھے۔ فصاحت و بلاغت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی آپ کا ہمسر نہ تھا۔ صرف روانی اور جوشِ بیان ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنی نکتہ آفرینی، نکات، حکمت و دانش، معرفت کے اسرار و رموز اور معنی و مفہوم کے لحاظ سے بھی آپ کے خطبات علوم کا گنجینہ اور مشعلِ رُشد و ہدایت ہیں۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کشورِ خطابت کے اسی سلطان کے فرزندِ ارجمند اور اسی معدنِ فصاحت و بلاغت کے چمکتے موتی تھے۔ آپ نے اپنے عظیم المرتبت والد ماجد کی زبان مبارک سے بیسیوں خطبات سُنے اور ان سے فنِ خطابت کی تحصیل کی۔

اسی کسبِ فیض کا نتیجہ تھا کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی زبان کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی اور آپ کے الفاظ زمزم و سلسبیل میں نِکھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ جب آپ زبان کھولتے تھے تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی تھی اور لوگ چاہتے تھے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اسی طرح تقریر کرتے رہیں۔

ایک روز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آج تم خطبہ دو تاکہ میں دیکھوں کہ تم تقریر کر سکتے ہو یا نہیں؟ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ مجھے آپ کی موجودگی میں تقریر کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فوراً اُٹھے اور ایسی جگہ جا کر بیٹھ گئے جہاں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی نظر ان پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ چنانچہ حضرت امام حسن خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے

اور ایسی فصیح و بلیغ تقریر کی کہ سُننے والوں پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب حضرت امام حسن اپنا خطبہ ختم کر چکے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آڑ میں سے نکل آئے اور فرمایا کہ:

"سچ ہے باپ کی خصوصیات بیٹے
میں ضرور آتی ہیں۔"

ایک اور روایت میں آتا ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی تقریر سُن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور ان کی پیشانی چُوم لی۔ مگر اسے ہماری بد قسمتی کہنا چاہیئے کہ حضرت امام حسن کے خطبات بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔ بیشتر خطبات ایسے ہیں جو غلط طور پر ان سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ ایسے خطبات چند ہی ہیں جو آمیزش سے پاک ہیں۔ ایسے ہی خطبات میں سے ذیل کا خطبہ بھی ہے، جو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔

"اے لوگو! آج کی رات ایک ایسا شخص ہم سے جُدا ہو گیا کہ جس سے علم و عمل میں نہ پچھلے بڑھ سکے اور نہ اگلے بڑھ سکیں گے۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر جہاد میں حصّہ لیا اور اپنے آپ کو حضور پر سے قربان کرنے

کے لئے وقف کر دیا۔ وہ جس مہم پر گیا اللہ تعالیٰ نے اُسے مظفر و منصور کیا۔ اس نے اسلام کی عظمت کا نشان قلعۂ خیبر پر لہرایا۔ اس نے اپنے پیچھے زر و جواہر یا مال و منال کا کوئی ذخیرہ نہیں چھوڑا سوائے ان سات سو درہم کے جو ایک غلام خریدنے کے لئے جمع کئے تھے۔ جو شخص مجھے جانتا ہے اُسے تو خوب معلوم ہے کہ میں کون ہوں۔ جو مجھے نہیں جانتا اُسے جان لینا چاہیئے کہ میں علی کا بیٹا حسن (رضی اللہ عنہم) ہوں۔ میں بشیر و نذیر ہوں"۔

•

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے اس خطبے کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اے لوگو! یہ حسن (رضی اللہ عنہ) تمہارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے اور امیر المومنین علی (رضی اللہ عنہ) کے فرزند ہیں۔ تم ان کی بیعت و اطاعت کا جوا اپنے کندھے پر رکھ لو اور ان کی محبت کو خدا اور رسول کی محبت سمجھو۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی اس تقریر کے بعد

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی گئی۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی دوسری قابلِ ذکر تقریر وہ ہے جو آپ نے امیر معاویہ کی پیش قدمی کی خبر سُن کر مدائن کی طرف جاتے ہوئے ساباط کے مقام پر ارشاد فرمائی تھی۔ اس تقریر میں آپ نے فرمایا تھا کہ:

"اے میری قوم کے لوگو! جو مجھ پر اپنی جان فدا کرتے ہو۔ میں اپنے پروردگار سے امید رکھتا ہوں کہ وہ مجھ پر ہر ہر صبح اس حالت میں طلوع کرے گا کہ میں اس کے احسان کا شُکر و سپاس ادا کرتا رہوں گا۔ میں تمہیں ساری مخلوق کے ساتھ بھلائی کرنے کی نصیحت کرتا ہوں۔ میں نے آج تک کبھی اس حالت میں صبح نہیں کی کہ میرا سینہ کسی عداوت سے پُر ہو۔ کسی کے ساتھ بُرائی کرنا تو کجا میں تو برائی کرنے کا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لایا۔ میں کسی کو فریب میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتا۔ میں نفاق (نفاق سے آپ کی مُراد اہلِ شام اور اہلِ عراق کے درمیان کشیدگی تھی) کی اس حالت سے جسے تم محبوب تر رکھتے ہو اتحاد و اتفاق کی حالت کو بہت بہتر سمجھتا

ہوں۔ جس قدر تم اپنی ذات پر مہربان ہو میں اس سے کہیں زیادہ تم پر مہربان ہوں، جو چیز مجھے اپنے لئے پسند ہے وہی تمہارے لئے بھی پسند کرتا ہوں تمہیں لازم ہے کہ میرے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو، میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اور تمہیں اپنے رحم وکرم سے بخشش عطا فرمائے اور راہِ راست پر گامزن کر دے۔"

•

آپ کی تیسری اور قابلِ ذکر تقریر وہ ہے جو آپ نے خلافت سے دست برداری کے وقت مجمع عام میں ارشاد فرمائی۔ جس میں معززین کوفہ و دمشق کے علاوہ امیر معاویہ بھی موجود تھے۔ اس تقریر میں آپ نے فرمایا کہ

"امّا بعد! اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے اگلوں کو ہماری وجہ سے ہدایت یافتہ بنایا اور تمہارے پچھلوں کو ہمارے ذریعے خوں ریزی سے بچالیا۔ عقلمندوں میں سے سب سے بڑا عقلمند وہ ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا اور سب سے بڑا بے وقوف وہ ہے جس نے بداعمالیاں کیں۔

یہ مسئلہ (خلافت) جو میرے اور معاویہ کے درمیان متنازعہ فیہ ہے۔ اس کے مستحق معاویہ ہیں یا میں؛ دونوں صورتوں میں اُمّتِ محمّدیہ کی اصلاح اور مسلمانوں کو خوں ریزی سے بچانے کے لئے میں اس سے دست بردار ہوتا ہوں۔

اے معاویہ! یہ خلافت تمہارے لئے بڑی آزمائش ہے اور اس کی حقیقت عارضی سرمایہ سے زیادہ نہیں ہے۔"

•

کلام کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ بڑی سے بڑی بات کم سے کم الفاظ میں بیان کردی جائے۔ یہ خوبی حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے کلام میں بدرجہ کمال پائی جاتی ہے۔ آپ کی تقریروں کی سب سے بڑی خوبی اختصار اور جامعیت ہے۔ طولِ کلام کو آپ ناپسند کرتے تھے اور ہمیشہ نہایت مختصر خطبہ دیتے تھے۔ جس میں معنی کا سمندر موجزن ہوتا تھا۔ مندرجہ بالا خطبہ بھی اختصار و جامعیت اور معنویت کا شاہکار ہے۔ اس میں آپ نے خلافت سے دست برداری کے متعلق تین باتوں کا بڑے اختصار اور نہایت خوب صورتی کے ساتھ جواب دیا

ہے۔ آپ کی خلافت سے دست برداری کے متعلق بعض
لوگ آپ پر کم فہمی کا الزام عاید کرتے ہیں کہ آپ نے بغیر
سوچے سمجھتے خلافت و امارت جیسی چیز معاویہ کے حوالے کر دی۔
اس اعتراض کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ عقلمندی کی
تعریف یہ نہیں ہے کہ انسان کسی عہدے کے ساتھ چمٹا رہے
بلکہ اصل عقلمندی یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے۔

اس سے آپ کی مُراد یہ تھی کہ میں نادانی کی بنا پر خلافت
سے دست بردار نہیں ہوا ہوں۔ بلکہ اس سے میرا مقصد اللہ
تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ اُس
شخص سے خوش ہوگا جس نے اس کے ہزارہا بندوں کو خوُن
ریزی سے بچالیا اور یہی سب سے بڑی عقلمندی اور تقویٰ
کی صحیح تعریف ہے۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے اس مختصر اور جامع
خطبہ میں نہایت محتاط اور حکیمانہ طریقہ سے یہ بھی بتادیا کہ میں
خلافت کو امیر معاویہ کا حق سمجھ کر نہیں دے رہا ہوں۔ اسے
آپ نے اللہ تعالیٰ کے سپُرد کر دیا اور فرمایا کہ یہ اقدام میں صرف
اُمّتِ محمّدیہ کے لئے کر رہا ہوں۔

اپنے اس حکیمانہ خطبے میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ

نے تیسری بات امیر معاویہ کے آئندہ فرائض حکومت کے متعلق بیان فرمائی اور انہیں بتایا کہ کوئی عہدہ و منصب حاصل کر لینا تو آسان ہے مگر اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا بڑا مشکل ہے۔ خصوصاً حکومت اور امارت سب سے بڑی آزمائش ہے۔ کہ اگر انسان اسے ہوس پرستی اور دنیا کمانے کا ذریعہ بنا لے تو یہ اسے بہت بڑے فتنے میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اور اس کے جاہ و جلال کی چکا چوند اس کی دینی بصیرت سلب کر لیتی ہے۔ اس لئے اے امیر معاویہ! تمہیں لازم ہے کہ اس خلافت کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرنا بندگانِ خدا پر ظلم نہ کرنا، کیوں کہ اس کی حقیقت ایسے سرمایہ کی ہے جو بہت جلد ضائع ہو جاتا ہے۔

نکاتِ حکمت و دانش

سیدنا حضرت امام حسن نے حضرت عثمان (رضی اللہ عنہم) کی شہادت سے لے کر اپنی خلافت سے دست برداری تک مذہب اور سیاست کے بے شمار نشیب و فراز دیکھے اور انہیں بڑے بڑے تجرباتی ادوار سے گزرنا پڑا۔ انقلاباتِ زمانہ کے مشاہدات اور ان کے ذاتی تجربات نے ان کی فراست میں

چار چاند لگا دیئے اور ان پر ایسے ایسے راز منکشف ہوئے جن سے عوام تو عوام خواص بھی محروم رہے۔ اپنے ان تجربات کو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے مختلف مواقع پر بڑے دلکش رنگ میں بیان فرمایا۔ حضرت امام کے ان نکاتِ دانش کے پس منظر میں وہ اخلاقی تعلیم بھی کارفرما ہے، جو آپ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مُبارک، آپ کی احادیث اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات سے حاصل کی۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ان اخلاقی نکات اور اسرارِ حکمت کی ایک خوبی یہ ہے کہ آپ نے ہر نکتہ کی وہ تعریف بیان کی ہے جو مروجہ اور مستعمل تعریف سے ہٹی ہوئی ہے اور جس میں ایسے معانی پوشیدہ ہیں جن تک عام لوگوں کی تو کیا خواص کی بھی نظر نہیں پہنچ سکی۔

مورخ یعقوبی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ سب سے اچھی زندگی کون گزارتا ہے۔ حضرت امام نے جواب دیا کہ سب سے اچھی زندگی وہ گزارتا ہے جو اپنی راحت میں دوسرے شخص کو بھی شریک کرے۔ پھر اس شخص نے پوچھا کہ سب سے خراب زندگی کون بسر کرتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ سب سے خراب زندگی

وہ شخص بسر کرتا ہے جس کے ساتھ کوئی دوسرا زندگی بسر نہ کر سکے۔

ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے موت سے بہت خوف آتا ہے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تجھے موت سے خوف اس لئے آتا ہے کہ تُو نے مال جمع کر رکھا ہے۔ اگر اسے خدا کے راستے میں صرف کر دیتا تو خوفزدہ ہونے کے بجائے خوش ہوتا۔

ایک روز امیر معاویہ نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ اے ابو محمد (یہ حضرت امام حسن کی کُنیّت تھی) تین باتیں ایسی ہیں، جن کی صحیح تعریف نہیں ہوتی۔ آپ نے پوچھا وہ کون سی باتیں ہیں۔ امیر معاویہ نے کہا مرّوت، کرم اور بہادری کی تعریف۔ حضرت امام حسن نے فرمایا کہ:

مروت: کی تعریف یہ ہے کہ انسان اپنے
مذہبی معاملات کو درست رکھے،
اپنی دولت کی کڑی نگرانی کرے،
اور اسے بے موقع صرف نہ ہونے
دے، ہر ایک کو سلام کرے اور
کوشش کرے کہ لوگ اسے محبوب
رکھیں۔

کرم : کی تعریف یہ ہے کہ انسان بغیر
مانگے عطا کرے۔ احسان اور حُسنِ
سُلوک سے پیش آئے ۔ لوگوں کی
ضیافت کرے مگر یہ بے محل نہ ہو۔
بہادری: کی تعریف یہ ہے کہ انسان اپنے
ہمسایہ کا دفاع کرے۔ جب اس
پر وقت پڑے تو اس کی امداد کرے
اور مصیبت و تنگدستی میں صبر سے
کام لے۔

•

ذیل میں آپ کے مختلف کلماتِ حکمت درج کئے جاتے ہیں جو مختلف مواقع پر آپ نے بیان فرمائے۔

• اعلیٰ درجے کے اخلاق دس ہیں۔

۱۔ راستبازی
۲۔ میدانِ جنگ میں پوری شدّت سے حملہ کرنا۔
۳۔ سائل کی ضرورت پوری کرنا۔
۴۔ لوگوں کے ساتھ حُسنِ اخلاق سے پیش آنا۔
۵۔ جو احسان نہ کرے اس پر بھی احسان کرنا۔

۶۔ قرابت داروں سے حسنِ سلوک کرنا۔

۷۔ اپنے خاندان کی حفاظت اور اس کی حمایت کرنا۔

۸۔ حق کو پہچاننا۔

۹۔ مہمان نوازی کرنا۔

۱۰۔ اور شرم وحیا کا دامن تھامے رکھنا تو سب سے بڑا اخلاق ہے۔

•

• جو ضرورت نااہل کی امداد سے پوری ہو اس سے بہتر اس کا پورا نہ ہونا ہے۔

• اللہ تعالیٰ نے تجھے جو علم عطا فرمایا ہے اس سے خود بھی فائدہ اُٹھا اور دوسروں کو بھی سکھا۔ یہ دونوں باتیں تیرے علم کی حفاظت کا موجب ہوں گی۔

• حسد کرنے سے دامن بچا۔ کیوں کہ میں نے جتنا حاسد کو ظالم ہوتے ہوئے مظلوم سے مشابہ دیکھا ہے اتنا کسی اور کو نہیں دیکھا۔

• جو عقل سے محروم ہے اس کا دامن ادب کی دولت سے بھی خالی ہے۔ جو شخص حوصلہ نہیں رکھتا وہ مروت سے محروم ہے۔

- جس کا دامن دولتِ دین سے خالی ہے اس میں شرم و حیا کا فقدان ہے۔
- عقل کا حقیقی مصرف یہ ہے کہ انسان دوسرے کے ساتھ مل کر پسندیدہ زندگی بسر کرے اور لوگوں سے اچھا سلوک کرے اس طرح اسے دینی اور دنیوی دونوں قسم کے فائدے حاصل ہوں گے۔
- جو شخص عقل نہیں رکھتا اسے دینی فلاح اور دنیوی بہبود دونوں سے محروم سمجھو۔
- تین چیزیں ایسی ہیں جو لوگوں کی ہلاکت کا موجب ہوتی ہیں۔ ۱۔غرور ۲۔حسد ۳۔حرص و ہوس۔
- غرور و نخوت نے شیطان کو بارگاہِ خداوندی سے مردود کیا۔
- حرص نفس اور جان دونوں کی دشمن ہے۔
- حسد ناپسندیدہ باتوں اور بداعمالیوں کی رہنمائی کرتی ہے۔
- ایک روز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ سے دریافت کیا کہ ملامت کی تعریف کیا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ مال و زر جمع کرنا۔

پھر پوچھا کہ حلم کسے کہتے ہیں۔ فرمایا کہ اپنے نفس پر قدرت حاصل کر لینا۔

پھر دریافت کیا کہ سیادت کی تعریف کیا ہے۔ حضرت امام نے عرض کیا کہ نیک کام انجام دینا اور بُرے کاموں کو چھوڑ دینے پر قادر ہونا۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا کہ اے میرے بیٹے! غفلت کی تعریف کیا ہے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ مسجد میں نماز فرض ادا کرنے کے لئے نہ جانا اور مفاسد کی پیروی کرنا

اعلیٰ حضرت رضا لائبریری
کتاب نمبر
صدر بازار، لاہور چھاؤنی